itsurdu.blogspot.com

بچے اور ادب

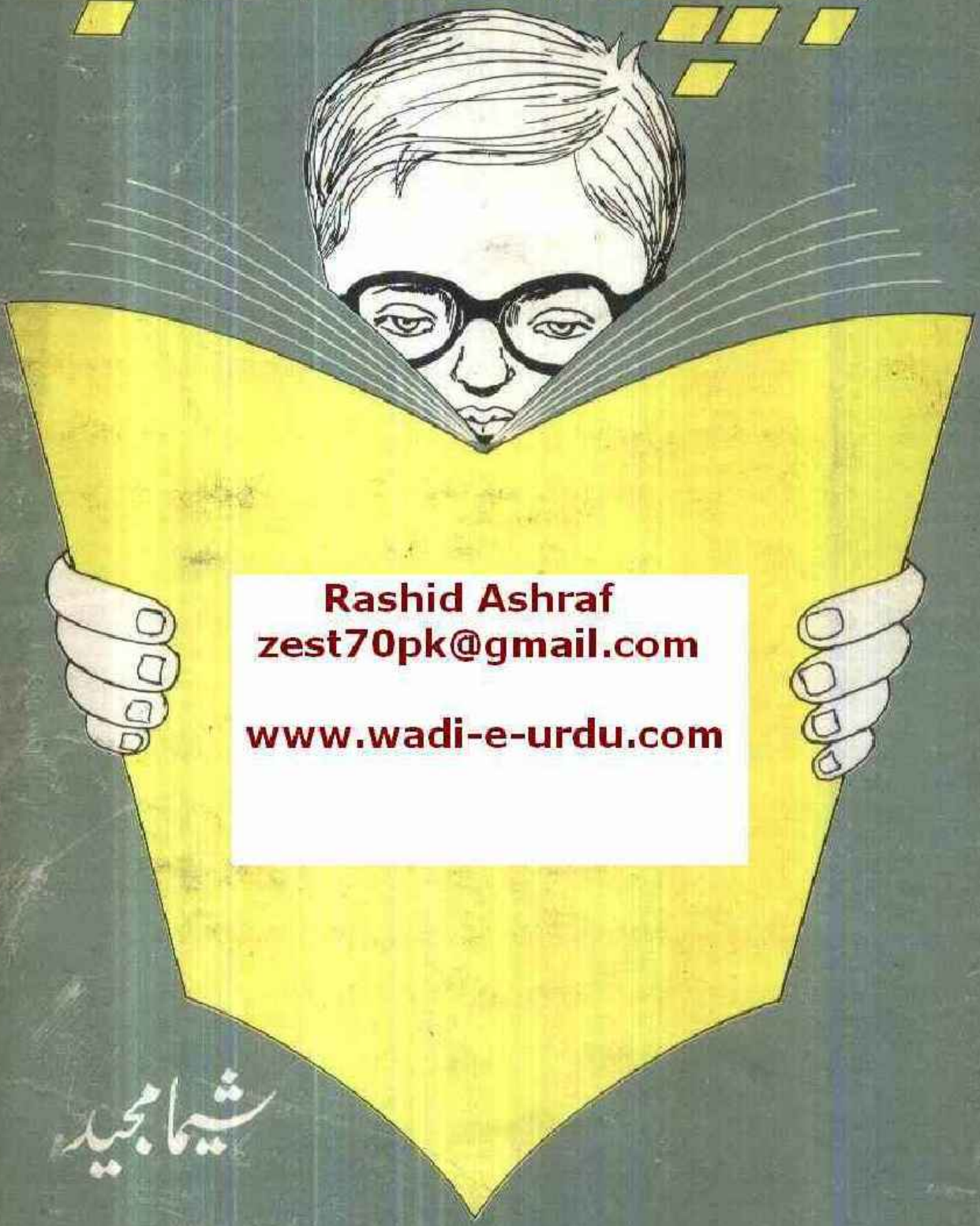

Rashid Ashraf
zest70pk@gmail.com

www.wadi-e-urdu.com

شیما مجید

گلوب پبلشرز ، اردو بازار لاہور

itsurdu.blogspot.com

محترم جناب اظہار احمد صاحب

(کے لیے)

شجاع مجید

۸-۱۲-۸۵

150

itsurdu.blogspot.com

پاکستان کے مکاتیب فکر کا بچوں کے ادب پر
مضامین کا مجموعہ

بچے اور ادب

مرتبہ
ثیما مجید

گلوب پبلشرز
اردو بازار ——— لاہور

Rashid Ashraf
zest70pk@gmail.com

www.wadi-e-urdu.com

Source:
Sunday Old Book Bazar
Karachi

11 May, 2014

itsurdu.blogspot.com

تعداد ... ایک ہزار
سال اشاعت ... ۱۹۸۵ء
طبع ... رشید نظامی
طابع ... نظامی پریس لاہور
ناشر ... گلوب پبلشرز اردو بازار لاہور
قیمت :

ابتدائیہ

بچے اور ادب

(۱)

بچے روزِ اوّل سے بنی نوعِ انسان کا قیمتی ترین سرمایہ ہیں۔ انسانی تاریخ کے ہر دور میں بچے کی دیکھ بھال اور اس کی شخصیت کو سمجھنے میں دل چسپی لی جاتی رہی ہے۔ لیکن احیائے علوم اور رفاہِ انسانی کی تحریکوں کے باعث بچے کی تعلیم و تدریس، ذہنی اور جسمانی نشوونما کو غیر معمولی اہمیت دی جانے لگی۔

انیسویں صدی کے آخری حصہ میں ماہرینِ نفسیات نے بچے کی زندگی کا ہر پہلو سے مطالعہ کیا۔ بچے کی فطرت، ذہنی و جسمانی نشوونما اور رہبری کے مسائل پر بڑی محنت کی۔ اس مقصد کے تحت مختلف شعبوں میں وسیع تحقیق ہو رہی ہے۔ روسو کے تعلیمی نظریات میں بچے کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ بقول اس کے بچے کی انفرادیت کی نشوونما اور اس کی منفرد تخلیقی قوتوں کو اجاگر کرنا تعلیم کا اہم فرض ہے۔ بچے کی انفرادیت کا فروغ دراصل معاشرے کی دولت کا فروغ ہے۔ یہ دولت مادّی نہیں بلکہ ذہنی و فکری دولت ہے۔ بچہ محض بالغ انسان کا چھوٹا سا سانچہ نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک وسیع منفرد اور دلچسپ شخصیت کا حامل ہے۔ اس کے مشاغل اور انفرادی خواہشات بالغوں سے کہیں مختلف ہیں اس کی ننھی سی شخصیت، جذبات اور امنگوں کی انوکھی کائنات ہے۔

تعلیم کا مقصد بچے کو محض بالغ زندگی کے لئے تیار کرنا ہی نہیں بلکہ بچے کے موجودہ تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر اس کی شخصیت کے مختلف مدارج کی مناسب انداز میں دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ مثلاً کھاد ڈالنا۔ پانی سے سیراب کرنا وغیرہ۔ گلشن ہی پودوں کو محض

itsurdu.blogspot.com

قدرتی عوامل کے رحم و کرم پر چھوڑ نہیں دیا جاتا بلکہ ان کی تراش خراش کی جاتی ہے اسی طرح معاشرے کے حسن کو برقرار رکھنے کے لئے لازم ہے۔ بچے کی تعلیم و تربیت کا ہر اعتبار سے خیال رکھا جائے تاکہ معاشرے کا مفید رکن بن سکے۔ بچہ محض اکائی ہی نہیں بلکہ مکمل فرد بھی ہوتا ہے۔ اس کے فکری، جذباتی اور معاشرتی پہلو بھی ہیں اور تقاضے بھی۔ جن کی تشفی لازمی اور ضروری ہے اس کا واسطہ محض اپنی ذات سے نہیں ہوتا، بلکہ دوسروں کی زندگی سے بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ کوئی انسان خلا میں ترقی نہیں کر سکتا۔

(۲)

انسانی بچے کے کردار کی تشکیل میں جو عناصر بہت اہم ہیں ان میں ایک عنصر ادب کا بھی ہے۔ بچے کی تعلیم و تربیت اور ذہنی نشوونما ان کی شخصیت کو نکھارنے اور بھرپور بنانے میں ادب بھی اہم رول ادا کرتا ہے۔ بلکہ ادب ایک ایسا شعبہ ہے جو نہ صرف بچے کی باطنی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے اور پوشیدہ قوتوں کی نشوونما ہوتی ہے بلکہ ادب کی تعلیم بچے کو ملک و قوم کی فلاح و ترقی میں بھرپور کردار ادا کرنے کے ساتھ ساتھ ان میں اعلیٰ اوصاف اور عمدہ اخلاق پیدا کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ بچے کا ذہن ایک صاف شفاف سلیٹ کی مانند ہوتا ہے۔ ابتدائی زندگی میں جو نقوش ذہن میں مرتسم ہوتے ہیں۔ جو رویے، اقدار، توقعات کو بناتے ہیں انہی کی روشنی میں بچہ اپنے تقاضے پورے کرے گا۔ ایچ جی ویلز کے مطابق طفولیت کے بعد بچے کو معاشرتی فرائض کا احساس ہونا چاہیے اسے چاہیئے کہ وہ خود مختار رہے۔ اپنی معاشرتی ذمہ داریوں سے پوری طرح آگاہ ہو۔ یہاں یہ امر ضروری ہے کہ بچے کی تعلیم و تربیت اسی نقطہ سے کی جائے کہ وہ صرف طرز زندگی سے روشناس نہ ہو بلکہ بہتر معاشرتی اور سماجی زندگی گزار سکے۔ تعلیم کا ہر قسم میں ایک خاص مفہوم ہے معاشرتی زندگی میں تعلیم کو وہی مقام حاصل ہے جو دماغ کو جسم میں۔ تمام قوی عروج کی جڑ بچے کی تعلیم ہے۔

تعلیم اور ادب ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں بلکہ ادب کے ذریعہ اپنے ثقافتی ورثے اور اقدار کو نئی نسل میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ انسان فطرتاً ادب کا محتاج

نہیں بلکہ ایک روحانی حقیقت جان کر اس کو پروان چڑھاتا ہے۔ جب تک بچے ادب اور زبان سے آشنا نہ ہوں وہ بڑے ہو کر ادب یا ثقافت کے لئے کوئی بھی کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتا۔ بچے کی طرح اس کا ادب بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے۔ ادب الاطفال کی بنیاد ایسے عناصر پر ہو جن میں بچے کی فطری جبلتیں پوری طرح نمایاں ہوں۔ اس کے مزاج اور ذوق و وجدان سے ہم آہنگ ہو۔

بچے میں فکر اور عمل کی افادیت کو اجاگر کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جب بچہ شعوری دور میں داخل ہو تو اس کے اندر ثقافتی مرکزیت کا جذبہ پیدا کیا جائے تاکہ وہ اپنے کلچر کے رنگ میں رنگا جائے۔ بچے کے سماجی ماحول میں زبان کا بڑا دخل ہوتا ہے زبان کے ذریعہ اپنا ادب و تہذیب کو آئندہ نسلوں میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ جہاں ہمیں فکری جذباتی اور معاشرتی ضرورتوں کو تسلیم کرنا ہے وہاں اس امر کی بھی ضرورت ہے ہم سب سے پہلے زبان کی اہمیت کو تسلیم کریں۔ زبان صرف فقرہ سازی اور ذخیرہ الفاظ تک محدود نہیں بلکہ اس کے ذریعہ رویوں اور اقدار کا ابلاغ ہوتا ہے۔ ترسیل کے اس عمل میں زبان اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ہر قوم کا اپنا خاص اسلوب ہوتا ہے۔ زبان ادب کے تجربات کی آئینہ دار ہوتی ہے اسی نقطہ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے ہم کہتے ہیں۔ تعلیم دراصل ابلاغ کا نام ہی ہے اور اسے مادری زبان میں ہونا چاہیئے تاکہ بچے اچھے طریقے سے اپنے ادب اور تہذیب کو سمجھ سکیں۔ تعلیم کے لغوی مفہوم بچے کی زندگی کو بنانے سنوارنے کا ہے۔ بچے کی زندگی بنانے سنوارنے میں ادب اہم رول ادا کرتا ہے۔ جب تک ہم زندگی کی سب سے اہم بنیادی ہوا کو نظر انداز کرتے رہیں گے تب تک ہمارا معاشرہ بحرانوں کا شکار رہتا رہے گا۔ یہ بات سو فیصد درست ہے کہ ہمارا نظام تعلیم حاکمان فرنگ کا ایسا ورثہ ہے جس سے ہم نہ صرف مرعوب ہوئے بلکہ اپنے ادب اور تہذیبی اقدار سے دور ہوتے جا رہے ہیں ہمارے ہاں جو بچوں کے ادب کے متعلق مضحکہ خیز باتیں ہوتی رہتی ہیں اس کی وجہ سے نہ تو ہم تسلی بخش ادب اور نہ ہی نصاب مرتب کر سکے اور نہ ہی اپنی سمت کو درست کرنے اور ادب و ثقافت کو پہچاننے کی کم از کم فکری سطح پر کبھی کوشش نہیں کی۔ دراصل ہماری حالت

itsurdu.blogspot.com

اس مسافر کی سی ہے جو اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہو۔ جسے راستے کا سراغ نہ مل رہا ہو۔ اور وہ اپنی ساخت سے بھی بے بہرہ ہو۔ اس لئے ہم اکثر یہ کہتے ہیں کہ بچے کا نہ تو کوئی کلچر اور نہ ہی ادب ہوتا ہے لیکن ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ بے لچک ثقافتی ڈھانچے کے ساتھ قوم بھی اپنے وجود کو تادیر زندہ نہیں رکھ سکتی کیونکہ ادب اور کلچر وہ نظام حیات ہے جس پر کسی بھی نظام کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ ادب اور کلچر ہی کے ذریعہ سے معاشرہ کی تعمیر نو کی جاسکتی ہے اس کی وجہ سے معاشرہ کی تعمیر نو کی جاسکتی ہے اس کی وجہ سے معاشرہ میں جمود پیدا نہیں ہوتا۔ قوموں کے قافلے رواں دواں بڑھ چڑھ کر معاشرہ کی تشکیل نو کرتے رہتے ہیں۔ ادب اور کلچر دونوں مل کر بچے کی نشوونما میں مدد دیتے ہیں۔

(۴)

کتاب اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے اس کا مواد محنت اور تحقیق سے فراہم کیا گیا ہے۔ اردو میں بچوں کے ادب کا یہ جائزہ نہ صرف طلباء کے لئے مفید ہوگا بلکہ اردو کے مصنفین کو بچوں کے لئے نئی نئی چیزیں لکھنے کی تحریک ہوگی۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے اس صدی میں بچے کے ادب کو وہ اہمیت اور وقعت حاصل ہوگی۔ جو پہلے نہیں تھی۔

آخر میں میری گذارش ان مصنفین سے ہے جن کے مضامین اس کتاب میں شامل ہیں اگر ان کو کوئی اعتراض یا شکوہ ہو تو وہ براہ راست مرتبہ سے رابطہ قائم کریں۔

شیما مجید
۲۵/۹/۵۵
مکان نمبر ۲۔ گلی نمبر ۳۰
عبدالکریم روڈ لاہور

ترتیب

۱۔ بچوں کی تعلیم و تربیت	علامہ اقبالؒ	۹
۲۔ بچوں کی تعلیم میں صحیح و غلط	پروفیسر احمد علی	۱۷
۳۔ تعمیر ملک و ملت میں بچوں کے ادب کا حصہ	صوفی تبسم	۲۲
۴۔ بچوں کا ادب	ممتاز حسن	۲۸
۵۔ بچوں کا ادب اور نفسیات	ڈاکٹر سلیم اختر	۳۹
۶۔ بچوں کے لئے سیرت کا ادب	محمود الرحمٰن	۵۲
۷۔ بچوں کا ادب ــــ کہانی	میرزا ادیب	۵۹
۸۔ بچوں کے لئے شاعری	محمد امجد	۷۱
۹۔ بچوں کے لئے تفریحی ادب	حامد علی خاں	۸۷
۱۰۔ بچوں کا جاسوسی ادب	ذوالفقار احمد تابش	۹۳
۱۱۔ پریوں کی کہانیوں سے خوف کیوں؟	ڈاکٹر سہیل احمد خاں	۹۸
۱۲۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا ادب	خاطر غزنوی	۱۰۲
۱۳۔ بچوں کے لئے کتابیں	سید امتیاز علی تاج	۱۱۴
۱۴۔ بچوں کی کتابوں کی زبان	انتظار حسین	۱۲۳
۱۵۔ بچوں میں مطالعہ کی عادات	محمد مرزا	۱۲۷
۱۶۔ آرٹ کی تعلیم	علی اختر مرزا	۱۴۵
۱۷۔ کیا پاکستانی بچے کا کوئی کلچر نہیں ہوتا	گلزار آفاقی	۱۴۸
۱۸۔ پاکستان میں بچوں کا ادب اور مسائل	ریاض صدیقی	۱۵۷

itsurdu.blogspot.com

علاقائی ادب

۱۹۔ اُردو میں بچوں کا ادب .. .. مجتبیٰ حسین ۱۷۱

۲۰۔ پنجابی لوک ادب اور بچے .. .. شہباز ملک ۱۸۰

۲۱۔ سندھی میں بچوں کا ادب .. .. حیدر سندھی ۱۸۹

بچّوں کی تعلیم و تربیت

علامہ اقبال

پڑھے ہوئے شاگردوں کو پڑھانا ایک آسان کام ہے، مگر انجان بچوں کی تعلیم ایک ایسا دشوار امر ہے کہ ہمارے ملک کے معلّم اس کی دقتوں سے ابھی پورے طور پر آشنا نہیں، ہمارا پرانا طریقہ تعلیم چونکہ بچوں کے قوائے عقلیہ و واہمہ کے مدارج نمو کو ملحوظ نہیں رکھتا اس واسطے اس کا نتیجہ ان کے حق میں نہایت مضر ثابت ہوتا ہے، ان کے قوائے ذہنیہ برباد ہو جاتے ہیں اور اُن کے چہروں پر ذکاوت کی وہ چمک نظر نہیں آتی جو اس بے فکری کی زندگی کے ساتھ مختص ہے، بڑی عمر میں یہ تعلیمی نقص اور بھی وضاحت سے دکھائی دیتا ہے۔ روزمرّہ کے معاملات کا سمجھنا اور ان کی پیچیدگیوں کو سلجھانا جو ایک عملی طبیعت کے آدمی کے لئے نہایت ضروری اوصاف ہیں ان میں سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتے انکی زندگی ناکامیوں کا ایک افسوسناک سلسلہ ہوتی ہے اور سوسائٹی کے لئے ان کا وجود محض معطل ہو جاتا ہے۔

سچ پوچھیے تو تمام قومی عروج کی جڑ بچوں کی تعلیم ہے۔ اگر طریق تعلیم علمی اصولوں پر مبنی ہو تو تھوڑے ہی عرصہ میں تمام تمدنی شکایات کافور ہو جائیں اور دنیوی زندگی ایک ایسا دلفریب نظارہ معلوم ہو کہ اس کے ظاہری حسن کو مطعون کرنے والے فلسفی بھی اس کی خوبیوں کے ثناخواں بن جائیں۔ انسان کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ دنیا کے لئے اس کا وجود زینت کا باعث ہو اور جیسا کہ ایک یونانی شاعر کہتا ہے۔ اس کے ہر فعل میں ایک قسم کی روشنی ہو جس کی کرنیں اوروں پر پڑ کے ان کو دیانت داری اور صلح کاری کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا سبق دیں، اس کی ہمدردی کا دائرہ دن بدن وسیع ہونا چاہیئے تاکہ اس کے قلب میں وہ وسعت پیدا ہو جو روح کے آئینہ سے تعصبات اور توہمات کے زنگ کو دور کر کے اسے مجلّا و مصفّا کر دیتی ہے، صدہا انسان ایسے ہیں جو دنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں، مگر اپنے اخلاقی تعلقات سے محض جاہل ہوتے ہیں، ان کی زندگی بہائم کی زندگی ہے کیونکہ

itsurdu.blogspot.com

ان کا ہر فعل خود غرضی اور بیجا خودداری کے اصولوں پر مبنی ہوتا ہے۔ ان کے تاثرات کا دائرہ زیادہ سے زیادہ اپنے خاندان کے افراد تک محدود ہوتا ہے۔ اور وہ اس مبارک تعلق سے غافل ہوتے ہیں جو بحیثیت انسان ہونے کے ان کو باقی افراد بنی نوع سے ہے۔ حقیقی انسانیت یہ ہے کہ انسان کو اپنے فرائض سے پوری پوری آگاہی ہو اور وہ اپنے آپ کو اس عظیم الشان درخت کی ایک شاخ محسوس کرے جس کی جڑ تو زمین میں ہے مگر اس کی شاخیں آسمان کے دامن کو چھوتی ہیں۔ اس قسم کا کامل انسان بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر انسانی بچے کی تربیت میں یہ غرض ملحوظ رکھی جائے۔ کیونکہ یہ کمال اخلاقی تعلیم و تربیت ہی کی وساطت سے حاصل ہو سکتا ہے، جو لوگ بچوں کی تعلیم و تربیت کے صحیح اور علمی اصول کو مدنظر نہیں رکھتے وہ اپنی نادانی سے سوسائٹی کے حقوق پر ایک ظالمانہ دست درازی کرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ تمام افراد سوسائٹی کے لئے انتہا درجہ کا مضر ہوتا ہے۔

اس مضمون کی تحریر سے ہماری یہ غرض ہے کہ علمی اصولوں کی رو سے بچپن کا مطالعہ کر کے یہ معلوم کریں کہ بچوں میں کون کون سے قوا کا ظہور پہلے ہوتا ہے اور ان کی تعلیم و تربیت کس طرح ہونی چاہیئے۔ ہم ایک ایسا طریق پیش کرنا چاہتے ہیں جو محض خیالی ہی نہیں ہے۔ بلکہ ایک قابل عمل طریق ہے جس سے بچوں کی تعلیم کے لئے ایسے آسان اور صریح اصول ہاتھ آجاتے ہیں جن کو معمولی سمجھ کا آدمی سمجھ سکتا ہے اور ان کے نتائج سے مستفید ہو سکتا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ناظرین ان سے فائدہ اٹھائیں گے اور اپنے بچوں کی ابتدائی تعلیم میں ان اصولوں کو ملحوظ خاطر رکھیں گے کیونکہ ؎

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

سب سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ وہ کون سے امور ہیں جو عالم طفلی کے ساتھ مختص ہیں، تاکہ بچوں کی تعلیم و تربیت میں ان کو ملحوظ رکھا جائے اور ان سے باحسن وجوہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے۔

(۱) اس ضمن میں پہلی بات جو ہر مطالعہ کرنے والے کو صاف دکھائی دیتی ہے یہ ہے

کہ بچوں میں ایک قسم کی اضطراری حرکت کا میلان ہوتا ہے جو نہ صرف انسان کے ساتھ ہی خاص ہے بلکہ ہر حیوان میں پائی جاتی ہے۔ دیکھئے بلی کا بچہ کیا مزے سے خود بخود کھیلتا ہے۔ چھوٹے کتے کی زنجیر کھول دو تو اضطراری حرکت کی خوشی میں پھولا نہیں سماتا۔

بین صاحب جو انیسویں صدی کے مشہور حکماء میں سے ہیں اس اضطراری جوش کو بچے کے نشوونما کے لئے بڑا ضروری جزو خیال کرتے ہیں کیونکہ اس اضطراری حالت میں اس کے اعضاء حرکت میں آنے کے لئے کسی بیرونی محرک کے محتاج نہیں ہوتے۔ بچوں میں اعصابی قوت کی ایک زائد مقدار ہوتی ہے جو کسی نہ کسی راہ سے صرف ہو کر ان کی خوشی کا موجب ٹھہرتی ہے اگرچہ بسا اوقات ان کے ماں باپ کو اس سے تکلیف بھی اٹھانی پڑتی ہے۔ بعض دفعہ اعصابی قوت کی یہ زائد مقدار رونے چلانے میں صرف ہو جاتی ہے۔ بعض دفعہ بے تحاشا ہنسنے اور کھیلنے کودنے میں پس جو لوگ بچوں کے رونے سے تنگ آتے ہیں ان کو یاد رہے کہ یہ بھی ان کے جسمانی اور روحانی نمو کے لئے ایک ضروری جزو ہے اس کے علاوہ اس قوت کے صرف ہونے کی اور بھی راہیں ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ بچے کے حواس خود بخود حرکت میں آتے ہیں، جس کی وجہ سے اسے خارجی اشیاء کا رفتہ رفتہ علم ہوتا جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ بچہ متعلم ہستی نہیں بلکہ سراپا ایک متحرک ہستی ہے۔ جس کی ہر طفلانہ حرکت سے کوئی نہ کوئی تعلیمی فائدہ اٹھانا چاہیئے مثلاً اینٹوں کے گھر بنانا، ٹوپی میں مٹکے پرونا، گانا وغیرہ، وہ زائد اعصابی قوت جو رونے اور بیجا شور کرنے میں صرف ہوتی ہے ایک باقاعدہ شور یا راگ میں آسانی سے منتقل ہو سکتی ہے اور وہ قوت جو مدرسان اشیاء کے چھونے اور دیگر چیزوں کو ادھر ادھر پھینکنے میں صرف ہوتی ہے اینٹوں کے گھر بنانے میں سہولت سے صرف ہو سکتی ہے۔

(۲) بچپن کا ایک اور خاصہ یہ ہے کہ اس عمر میں کسی شئے پر مسلسل توجہ نہیں ہو سکتی۔ جس طرح اس کے جسمانی قوا کو ایک جگہ قرار نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اس کے قوائے عقلیہ بھی ایک نقطہ پر عرصہ کے لئے قرار نہیں رہ سکتے۔ جس طرح ہاتھ پیر نچلے نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح اس کی توجہ میں بھی ایک طرح کی بے قراری ہے جو اسے ایک مقام پر جمنے نہیں دیتی لہٰذا ہر طریق تعلیم میں اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ سبق طویل نہ ہوں اور چھوٹے چھوٹے

itsurdu.blogspot.com

حصوں پر منقسم ہوں تاکہ پڑھتے وقت بچے کے مختلف قوار کو تحریک ہو۔ اس کے علاوہ یہ بھی لازم ہے کہ ہر سبق میں ایک خاص مشترک بات ہو، تاکہ ایک خاص مقام پر توجہ لگانے کی عادت بھی ترقی کرتی جائے۔

(۳) بچوں کو اشیاء کے غور سے دیکھنے اور بالخصوص ان کے چھونے میں لطف آتا ہے، تین مہینے کی عمر کا بچہ ہو اور اس کی توجہ روشنی کی طرف منتقل ہو جائے تو ہاتھ پھیلاتا ہے اور شمع کے شعلے کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے ــ نظر کے فعل سے اس کی تسلی نہیں ہوتی ــ حس لامسہ سے بھی مدد طلب کرتا ہے، کیونکہ اسے قدرتاً اشیاء خارجی کے چھونے میں مزا آتا ہے یہ بات تو ہر شخص کے تجربہ میں آئی ہوگی کہ جب بچہ کی نظر دیوار کی کسی تصویر پر جا پڑے تو بے اختیار چلانے لگتا ہے اور چاہتا ہے کہ تصویر اتار کر اس کے ہاتھوں میں دے دی جائے، چلانے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے میاں اب چپ ہونے میں نہیں آئینگے مگر جب مطلوبہ شے سامنے رکھ دی جائے تو چپ ہو جاتا تو ایک طرف بعض اوقات آپ کی ہنسی بھی نکل جاتی ہے۔ پس جس شئے کے متعلق سبق دو، اس کو بچے کے سامنے رکھو اور جب سبق ختم ہو جائے تو شئے مذکور اس کے ہاتھ میں دے دو۔ مشاہدہ سے حس بصر کی تربیت ہوتی ہے، چھونے سے قوت لمس معتد بہ فروغ پاتی ہے۔ گفت گو اور راگ وغیرہ سے قوت سامعہ ترقی کرتی ہے۔ اس طرح لمس اور بصر کے متحدہ استعمال سے بچہ کو صورت شئے کا ادراک ہوتا جائے گا۔

(۴) بچے کی توجہ صورت شئے سے زیادہ رنگِ شئے کی طرف لگتی ہے۔ جن اشیاء کا رنگ شوخ ہو اس کا دھیان زیادہ تر انھیں کی طرف رہتا ہے، کسی اعلیٰ درجے کے مصور کی بنائی ہوئی تصویر اس کے سامنے رکھ دو۔ اگر اس کا رنگ شوخ اور چمکیلا نہیں تو اسے اس کی پرواہ بھی نہیں ہوگی، برخلاف اس کے اپنی چھوٹی سی کتاب کی رنگین تصویروں پر جان دیتا ہے۔ بول چال ملاحظہ کیجئے، لفظ سرخ، نیلا وغیرہ تو پہلے سیکھ جاتا ہے اور لفظ مربع تکون وغیرہ کہیں بعد میں جا کر، اس سے یہ اصول قائم ہوا کہ بچے کے ابتدائی سبق رنگین اشیاء کے متعلق ہونے چاہئیں۔

(۵) بچے میں بڑوں کی نقل کرنے کا مادہ خصوصیت سے زیادہ ہوتا ہے، ماں ہنستی ہے تو خود بھی بے اختیار ہنس پڑتا ہے، باپ کوئی لفظ بولے تو اس کی آواز کی نقل اتارے بغیر نہیں رہتا۔ ذرا بڑا ہوتا ہے اور کچھ باتیں بھی سیکھ جاتا ہے تو اپنے ہمجولیوں کو کہتا ہے۔ آؤ بھئی ہم مولوی بنتے ہیں تم شاگرد بنو، کبھی بازار کے دکان داروں کی طرح سودا سلف بیچتا ہے، کبھی پھر پھر کر اونچی آواز دیتا ہے کہ "چلے آؤ انار سستے لگا دیئے"۔ اس وقت میں بڑا ضروری ہے کہ استاد اپنی مثال بچے کے سامنے پیش کرے تاکہ اسے اس کے ہر فعل کی نقل کرنے کی تحریک ہو۔

(۶) قوتِ متخیلہ یا واہمہ بھی بچوں میں نمایاں ہوتی ہے، شام ہوئی اور لگا تتلانے اپنی ماں کو "اماں جان! کوئی کہانی تو کہہ دو"۔ "ماں چڑیا کوے کی کہانی سناتی ہے تو خوشی کے مارے لوٹ جاتا ہے۔ ذرا بڑا ہو کر پڑھنا سیکھ گیا تو ناولوں اور افسانوں کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ استاد کو چاہیئے کہ قوتِ واہمہ کی نمو کی طرف بالخصوص خیال رکھے، ایسا نہ ہو کہ یہ قوت بے قاعدہ طور پر بڑھ جائے اور اس سے قوائے عقلیہ کی ترقی میں نقص پیدا ہو۔ بعض حکماء کی رائے ہے کہ اس قوت کی تربیت کی اتنی ضرورت نہیں کہ جس قدر کہ اسے مناسب حدود کے اندر رکھنے کی ہے۔ بچے کی اس خصوصیت سے بے انتہا تعلیمی فائدہ ہو سکتا ہے۔ اکثر مکتبوں میں لڑکے کاغذ کی کشتیاں دن رات بنایا کرتے ہیں۔ قوت واہمہ کے لئے یہ اچھی مشق ہے۔

(۷) بچوں میں ہمدردی کی علامات بھی ظاہر ہوتی ہیں جن سے بچے کی اخلاقی تعلیم میں ایک نمایاں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ کسی کو ہنستا دیکھے تو خود بھی ہنستا ہے۔ ماں باپ غمگین نظر آئیں تو خود بھی ویسی ہی صورت بنا لیتا ہے۔ تجربہ اور مشق سے یہ جبلی قوت بڑھتی جاتی ہے ابتدا میں اوروں کے غم سے متاثر ہو کر معلوم ہوتا ہے۔ استاد کو چاہیئے کہ اسے ہمدردی کے متعلق عمدہ عمدہ کہانیاں سنائے اور یاد کرائے۔ جس حیوان کے متعلق اسے سبق دینا ہو اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے تاکہ بچے کے لئے ایک عمدہ مثال تقلید کرنے کے لئے قائم ہو جائے۔

(۸) الفاظ یاد رکھنے کے لئے بچہ کا حافظہ حیرتناک ہے۔ اپنی مادری زبان کے

itsurdu.blogspot.com

پیچیدگیاں کس آسانی سے سیکھ جاتا ہے اور یاد کر لیتا ہے۔ معلم کو لازم ہے کہ اپنے شاگردوں کو عمدہ عمدہ اشعار اور نظمیں یاد کرائے اور پڑھے ہوئے سبقوں کے مضامین کی طرف بار بار اشارہ کرے۔

(۹) اس عمر میں قوتِ متمیزہ کمزور ہوتی ہے۔ اشیا کے باریک باریک فرق تو معلوم نہیں کر سکتا۔ ہاں بڑے بڑے اور نمایاں اختلافات مثلاً اختلافات صور اشیاء معلوم کر لیتا ہے۔ لہٰذا ابتدا میں ظاہر اختلافات کی طرف اسے توجہ دلانی چاہیئے۔ مثلاً دو چیزیں ایک گیند اور ایک پہلو دار شے اس کے سامنے رکھ دو اور دونوں کے اختلافات مندرجہ ذیل طور سے بیان کرو:

گیند	پہلو دار شے
ایک ہی سطح ہے	بہت سی سطحیں ہیں
کوئی گوشہ نہیں ہے	بہت سے گوشے ہیں
کوئی کنارہ نہیں	بہت سے کنارے ہیں

ان نمایاں اور ظاہری اختلافات کا علم دے چکنے کے بعد کسی اور شکل کی شئے پیش کرو اور علیحدہ علیحدہ گیند اور پہلو دار شے سے اس کا مقابلہ کر کے باریک باریک اختلافات واضح کرو۔

(۱۰) قوائے عقلیہ مثلاً تصدیق اور استدلال کا کمزور ہونا۔ بچہ سے ایسی فہمید کی توقع نہ رکھو جو ابھی تجربے اور علم سے بڑھنی ہے۔ ان قواء کے مدارج ترقی کا لحاظ استاد کے لئے نہایت ضروری ہے۔ دو عام اشیاء اس کے سامنے رکھو اور ان کے بڑے بڑے اختلافات بیان کرو۔ اسی طرح مقابلہ کرتے کرتے تصدیق پیدا کرو، مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ تصدیق بغیر تصورات کے محال ہے۔ کیونکہ یہ اصل میں دو تصورات کے مقابلہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ جو خود مختلف مدرکات کا مقابلہ کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً بہت سے افراد نوع انسان کا مقابلہ کرنے سے ان میں بعض مشترک اوصاف معلوم ہوتے ہیں جن کے اشتراک کی وجہ سے ہم ان سب افراد کو ایک مشترک اور حاوی نام دے دیتے ہیں جو ہر فرد پر صادق آتا ہو۔

پس معلوم ہوا کہ بچے سے ایسے تصورات کے علم کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ جس کے ضمنی کا علم ہی اس کو نہیں ہے۔ ایک برس کے بچے کو کیا علم کہ "حبِ وطن" کس جانور کا نام ہے۔ ہمارے بعض معلم بچہ کے ہاتھوں میں ایسی ابتدائی کتابیں رکھ دیتے ہیں جن کا پہلا باب مثلاً "خدا کی صفات" سے شروع ہوتا ہے۔ مگر انھیں یہ معلوم نہیں کہ خدا ایک ایسا مجرد تصور ہے جو قوائے عقلیہ کی حد کمال پر پہنچنے اور بہت سے علم حاصل کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے اور صفات شئے کا اس شے سے علیحدہ تصور کرنا ایک ایسا فعل ہے جو بچے سے کسی صورت میں ممکن ہی نہیں ہے۔ لہٰذا اس قسم کا علم دینا ممکن ہے کہ بعض وجوہ سے اچھا ہو مگر علمی اصولوں کی رو سے بچے کے حافظہ پر ایک بیجا اور غیر مفید بوجھ ڈالنے سے زیادہ نہیں ہے۔

جس طرح تصورات کے لئے مقابلہ مدرکات کی اور تصدیقات کے لئے مقابلہ تصورات کی ضرورت ہے اسی طرح استدلال کے لئے جو مقابلہ تصدیقات سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ بچے کے علم میں کافی تعداد تصدیقات کی ہو۔ استاد کو خیال رکھنا چاہیئے کہ بچے کے مدرکات، تصورات، تصدیقات اور استدلالات اس کے علم کے انداز کے ساتھ ساتھ ترقی کرتے جائیں۔

(۱۱) آخری خاصہ بچے کا یہ ہے کہ اخلاقی محرکات سے یا تو بچہ متاثر ہی نہیں ہوتا یا اگر ہوتا ہے تو نہایت اول درجہ پر، کیونکہ اس قسم کی تحریکوں سے متاثر ہونا اور اس اثر کو عملی زندگی کے دائرہ میں ظاہر کرنا ایک ایسا امر ہے کہ جو اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے معلمین کا فرض ہے کہ ابتدا سے ہی بچے میں اخلاقی تحریکوں سے متاثر ہونے کی قابلیت پیدا کرنے کی کوشش کریں، مثلاً شروع سے ہی ان کو ہمدردی کرنا سکھائیں اور نیز اس امر کی طرف پوری توجہ دیتے رہیں کہ بچہ اپنے سبق کے متعلق ضروری ترتیب کا لحاظ رکھے، کیونکہ امن اور صلح کاری کی عادت انھیں چھوٹی چھوٹی باتوں کا پیدا ہوتی ہے یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ نفس ناطقہ قواء کا ایک مجموعہ نہیں ہے بلکہ یہ اپنی ذات میں ایک واحد غیر منقسم شئے ہے اور اس کی ہر ایک قوت کا نشو و نما ہر دوسری قوت کے نشو و نما پر منحصر ہے۔

itsurdu.blogspot.com

جس طرح جسمانی اعضا تناسب کے اصولوں کے مطابق بڑھتے ہیں اسی طرح نفس ناطقہ کی قواء کا نشو و نما بھی انھیں اصولوں کے تحت میں ہے لہذا طریق تعلیم کامل وہی ہوگا جو نفس ناطقہ کے تمام قواء کے لئے یکساں ورزش کا سامان مہیا کرے۔ ادراک، تخیل، تاثر اور مشیت غرض نفس ناطقہ کی ہر قوت تحریک میں آنی چاہیئے۔ کیونکہ کامل طریق تعلیم کا منشا یہ ہے کہ نفس ناطقہ کی پوشیدہ قوتیں کمال پذیر ہوں، نہ یہ کہ بہت سی علمی باتیں دماغ میں جمع ہو جائیں۔

مندرجہ بالا سطور سے واضح ہو گیا ہوگا کہ ایک عمدہ اور مضبوط تعلیمی بنیاد رکھنے کے لئے بچے کے نشو و نما کا مطالعہ کہاں تک ضروری ہے۔ معلم حقیقت میں قوم کے محافظ ہیں۔ کیونکہ آئندہ نسلوں کو سنوارنا اور ان کو ملک کی خدمت کے قابل بنانا انھیں کی قدرت میں ہے۔ سب محنتوں سے اعلیٰ درجہ کی محنت اور سب کارگزاریوں سے زیادہ بیش قیمت کارگزاری ملک کے معلموں کی کارگزاری ہے۔ اگرچہ بدقسمتی سے اس ملک میں اس مبارک پیشہ کی وہ قدر نہیں جو قدر ہونی چاہیئے۔ معلم کا فرض تمام فرضوں سے زیادہ مشکل اور اہم ہے کیونکہ تمام قسم کی اخلاقی، تمدنی اور مذہبی نیکیوں کی کلید اسی کے ہاتھ میں ہے اور تمام قسم کی ملکی ترقی کا سرچشمہ اسی کی محنت ہے۔ پس تعلیم پیشہ اصحاب کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے پیشہ کے تقدس اور بزرگی کے لحاظ سے اپنے طریق تعلیم کو اعلیٰ درجہ کے علمی اصولوں پر قائم کریں۔ جس کا نتیجہ یقیناً یہ ہوگا کہ ان کے دم قدم کی بدولت علم کا ایک سچا عشق پیدا ہو جائے گا جس کی گرمی میں وہ تمدنی اور سیاسی سرسبزی مضمر ہے جس سے قومیں معراج کمال تک پہنچ سکتی ہیں۔

(مخزن جنوری ۱۹۰۲ء)

بچوں کی تعلیم میں صحیح و غلط

پروفیسر احمد علی

جن ممالک اور اقوام کی ترقی بیرونی تسلط و حکمرانی کی وجہ سے رک جاتی ہے۔ مثلاً پچھلی صدی کا برصغیر پاک و ہند، وہ معاشرتی اور تعلیمی لحاظ سے پسماندہ رہنے پر مجبور ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ روایت کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے بلکہ اپنے ثقافتی اور تمدنی سانچوں میں ایسے نامانوس اور غیر ملکی معیاروں کی آمیزش ہونے لگتی ہے جو قوم کے مزاج کو راس نہیں ہوتے۔ نئی چیزوں سے مکمل مطابقت و ہم آہنگی ایک ناممکن بات ہے، اس لئے پرانی قدریں تہ و بالا ہو جاتی ہیں اور ایک ایسی آب و ہوا میں وہ شاذ ہی پھل پھول سکتی ہیں جو غیر ہمدرد حکمرانوں کے رویے کے باعث "ناموافق" اور ان کے لائے ہوئے خیالات کی وجہ سے زہر آلود بن چکی ہو۔

گزشتہ ڈیڑھ سو سال کے دوران میں اس برصغیر میں جو سیاسی نشیب و فراز آئے ان کی وجہ سے وہ عقائد و رسوم درہم برہم ہو کر رہ گئے، جو مغلوں کے عہد میں رائج تھے۔ مغلوں نے یہ عقائد و رسوم اپنی جگہ اپنے پیش روؤں سے مستعار لئے تھے۔ جنھوں نے یہ ایران اور اسلامی دنیا کے جچے جمائے تمدن سے اخذ کئے تھے۔ اس تبدیلی کا سب سے بڑا نتیجہ یہ تھا کہ نظام تعلیم بدل گیا اور اس طرح جو ثقافتی خلا پیدا ہوا۔ اسے جدوجہد آزادی کے دوران میں یا حصول آزادی کے بعد اب تک پُر نہیں کیا جا سکا۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مکتب یا مسجد میں تعلیم کی پرانی اساس شمالی تھی۔ پرانا طریقہ تعلیم بڑی حد تک فرسودہ اور سائنسی اور نفسیات کے میدانوں میں تیزی سے بدلتے ہوئے معیاروں اور تقاضوں کے لئے ناموزوں ہو چکا تھا۔ یہ زمانے کا چیلنج قبول کرنے کے ناقابل تھا۔ یہ ہماری تیزی سے بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق خود کو نہیں ڈھال سکتا تھا اس کے باوجود، چونکہ یہ ارتقائی عمل کا نتیجہ تھا۔ جچے جمائے تمدن اور معاشرتی نظام

itsurdu.blogspot.com

کے بعض تقاضوں کو ضرور پورا کرتا تھا جو اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے آغاز میں موجود مروج تھے۔

اس وقت سے اب تک علم کی سرحدیں اتنی دور دور تک وسیع ہو چکی ہیں کہ نہ یقین آتا ہے، نہ تصور کیا جا سکتا ہے۔ پرانے زمانے کا استاد معینہ علم کی حدود کے اندر اندر خاص قسم کے خیالات کا ایک خاص قسم کے نظام فکر یا فلسفے یا منطق ہی کو سمجھنے سمجھانے کے قابل ہو سکتا تھا۔ لیکن چونکہ وہ اس نظام کا حصہ اور مروجہ علم و فضل کا پابند تھا اس لئے وہ نہ تو سائنسی تحقیق کے تازہ انکشافات کو سمجھ سکتا تھا اور نہ ان دماغوں کے عقلی تقاضوں سے مطابقت پیدا کر سکتا تھا جو معاشرے اور فطرت کے مسلمہ قوانین سے بغاوت پر تلے ہوئے تھے۔ تاہم اس کو ایک فائدہ ضرور حاصل تھا۔ اور غالباً واحد فائدہ۔ یہ کہ وہ اپنی ثقافتی حقیقت اپنی معاشرتی اساس اور اپنے مخصوص طرز حیات سے مکمل طور پر آگاہ تھا۔ یہ اس بات کا جواز نہیں ہے کہ پرانے استاد کو قائم رہنا چاہیئے تھا۔ اور نہ اس سے یہ مراد لینی چاہیئے لیکن اس کی جگہ جو نیا نظام آیا ہے اس کی وجہ سے ایک وسیع خلا پیدا ہو گیا ہے، جسے پُر نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی ثقافتی وضع کا کوئی لحاظ نہ رہا۔ نقطہ نظر، خیالات، طرز فکر، طرز معاشرت میں تبدیلیاں پیدا ہونے کے باوجود اپنی ثقافتی وضع کو نظر انداز کرنے کا رجحان ایک عام قومی وبا بن چکا ہے اور جب تک اُردو ہماری مادری اور قومی زبان ہے۔ اور انگریزی یا امریکی مکمل طور پر اس کی جگہ نہ لے یہ بے التفاتی برقرار رہے گی اور برقرار رہنی چاہیئے کیونکہ اردو کے مبادیات اظہار ہندی، فارسی، ترکی اور مشرق وسطیٰ کی زبانوں سے ماخوذ ہیں انگریزی سے ماخوذ نہیں ہیں۔ اور وہ بھی سعدی اور حافظ کی زبان سے، جامی یا رومی کی زبان سے نہیں۔ آج بھی ہماری شاعری کی بہترین صداؤں میں انہی کی گونج سنائی دیتی ہے۔

ایذرا پاؤنڈ اور ٹی ایس ایلیٹ ہمارے قومی تخیل کے لئے وہ قربت اور بے تکلفی نہیں رکھتے۔ جو فارسی کے شاعر رکھتے ہیں، خواہ مغربی تنقید کے زیر اثر پنپنے والے دانشور کچھ بھی کہیں۔

جب بچہ مکتب جایا کرتا تھا تو اس کے خیالات کی بنیاد اپنی سرزمین میں تھی اس کے ثقافتی مضمرات اس کے اپنے تھے۔ تعلیم و تدریس کا طریقہ بے شک خراب تھا، جو مضامین پڑھائے جاتے تھے وہ بھی متروک ہو چکے تھے لیکن اس کی مادری زبان میں فارسی کی خوشبو اور زرخیزی پائی جاتی تھی جو اس وقت لازمی مضمون کا درجہ رکھتی تھی۔ قصبات اور دیہات اور دور دراز گوشوں میں بھی فارسی کی روحانی تاثیر کو محسوس کیا جاتا تھا۔ کیونکہ یہ زبان ماں کے دودھ کے ساتھ ملتی تھی اور معاشرتی فضا میں رچی ہوئی تھی۔ اب انگریزی معروف و مقبول بن چکی ہے۔ اس نے ہمارے عقلی اور سائنسی افق کو وسیع کیا ہے۔ تیزی سے سمٹتی ہوئی دنیا میں، ترقی کی شاہراہ پر چلاتے ہوئے ہمیں 'جدید' بنایا ہے۔ اس نے ہمیں امریکہ اور برطانیہ جیسے ملکوں کی پہلی صف میں لا کھڑا کرنے میں مدد دی ہے۔ لیکن انگریزی ہمیں اندر سے تبدیل کرنے میں ناکام رہی۔ یہ ہمیں باطنی یا لسانی طور پر نہیں بدل سکتی۔ آخر کار ہم 'مشرقی' ہونے کی حیثیت میں ابھریں گے اور قائم و دائم رہیں گے۔ مغرب کے حاشیہ بردار کی حیثیت میں مستقبل میں ہمارا کوئی مقام نہیں۔ اسی طرح ہم کبھی انگریز نہیں بن سکتے خواہ ہم اپنے چہرے پر کتنا ہی غازہ ملیں۔ پوڈر ملیں۔ بنیادی طور پر ہم پاکستانی ہی رہیں گے۔

یہ انگریزی کے مقلد نثر نگار اور مغرب کے تقلید پرست شاعر، جو چاہیں سو کہیں، مگر یہ حقیقت ہے کہ اس کی نثر میں انگریزی اسلوب بیان اور محاورات کا استعمال اور اس کی شاعری میں رمبا ڈیرکے یا سپنڈر یا میکلیس کے استعارات اور تشبیہات کی بازگشت اُردو کے مزاج کے بالکل برعکس ہے اور بہت زیادہ عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے۔ ادیب کے انگریزی لباس سے بھی زیادہ۔ اس کی نثر اور اس کی شاعری کا رشتہ اس معاشرتی ماحول سے منقطع ہے۔ جس کو وہ اپنی اور مادری یا قومی زبان میں ڈھالنے کی کوشش کر رہا ہے اور یوں نظام تعلیم ناکام ہو چکا ہے۔ کیونکہ اس نے ہماری معاشرتی اور ثقافتی اقدار اور لوگوں کے تاریخی پس منظر سے رشتہ توڑ لیا ہے۔ طلبا کو مضامین پڑھایئے جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں ان کو انگریزی بھی پڑھنے دیجئے۔ امریکیوں کی طرح جینا بھی سیکھایئے کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن

itsurdu.blogspot.com

انھیں اپنے لوگوں کی قربت کا احساس بھی دلایئے کوئی ایسی چیز جو ان کی قوتِ متخیلہ کو جگائے جو ان میں تخلیقی طبعزاد غور و فکر کی صلاحیت پیدا کرے جو ان میں انسانیت و انسان دوستی اور بلند حوصلگی پیدا کرے۔ محض تعلیمی ڈگریاں اور سرٹیفکیٹ دینے سے کیا فائدہ جو اپنے ظاہری چہرے کے پیچھے جہالت کا گرد و غبار چھپائے ہوئے ہوتی ہے۔

عوامی اور معاشرتی احساس قربت کی جڑیں بچپن اور ماضی کی تحت الشعوری یادوں میں پیوست ہوتی ہیں۔ انگریزی میں بچوں کے گیت اور نظمیں اور کہانیاں بچے کو انگلستان کے ماحول کا حصہ نہیں بنا سکتیں۔ اکثر اساتذہ سے HUMPTY DUMPTY کا مفہوم پوچھا گیا تو وہ بتا نہ سکے کہ یہ کیا چیز ہے۔ ہماری موسیقی اور نغمہ سرائی کے مبادیات، سینما کی وجہ سے مسخ ہو جانے کے باوجود، مغربی موسیقی کے مبادیات سے مختلف ہیں۔ پس ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بچوں کی تعلیم بچوں کی نفسیات کے مطابق ہونی چاہیئے۔ ہمیں اسے ایسی نظمیں اور کہانیاں سکھانی چاہئیں۔ جو اس کی قوتِ متخیلہ کو تیز کر دیں جو اس کے اندر تجسس، تحیر اور حقیقی ولولہ انگیزی پیدا کر دیں جو اس میں اظہار ذات اور حسن کی تلاش کی سچی لگن پیدا کر دیں۔ کیونکہ بہر صورت حسن حصولِ علم اور تخلیق کے لئے پہلی منزل ہے۔ اور یہی اچھی تعلیم کا صحیح نصب العین ہے۔

ہمیں اپنے بچے کو وہ لوریاں اور ننھی منی کہانیاں سنانے اور سکھانے سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں جو بہت عرصہ پہلے لکھی گئی تھیں۔ جن کا زمانہ تصنیف ابھی تک پردہ خفا میں ہے اور آج جن کے مصنفین کے نام تک معلوم نہیں، اور یہ گمنام مصنف بچوں کی نفسیات کو آج کے تمام مقبول و معروف ادیبوں اور شاعروں سے زیادہ جانتے تھے۔ کوئی اسماعیل میرٹھی بھی، جو مغرب کی تقلید میں بچوں کا ادب لکھتا ہے۔ بچے کے دل کے اتنا قریب نہیں ہو سکتا، جتنی قریب یہ چندا ماموں یا بارش یا پرندوں کی نظمیں اور کہانیاں پہنچ سکتی ہیں۔ مثلاً یہ مشہور نظم :-

چندا ماموں دُور کے
بڑے پکائیں بُور کے
آپ کھائیں تھالی میں
ہم کو دیں پیالی میں

پیالی گئی ٹوٹ
چندا ماموں گئے رُوٹھ
پیالی لائے اور
چندا ماموں آئے دوڑ

ہمارے ماہرین تعلیم نے ایسی نظموں کی کبھی قدر نہیں جانی۔ سادہ زبان اور روزمرہ میں لکھی ہوئی نظموں کو ہمیشہ غیر شاعرانہ اور غیر فنی سمجھا اور ان کو سننے سنانے کا کام انہوں نے نانیوں دادیوں پر چھوڑ رکھا۔ لیکن ہماری آج کی اردو ادب ترقی کی اس منزل پر پہنچ چکی ہے جہاں سینہ بہ سینہ چلنے والا ادب بھی اس کی ادبی روایت کا حصہ ہے۔

ہمارا بچہ بگڑے ہوئے یا بگاڑے ہوئے ماہرین تعلیم کے رحم و کرم پر ہونے کی وجہ سے آج تک نقصان اٹھاتا رہا ہے۔ کتابوں میں چھپے ہوئے "بہترین" ادب کو بھی سمجھنے سے قاصر رہا ہے اس کے لئے لوریاں، نظموں اور ترانوں کی کوئی اچھی سی کتاب نہیں۔ دور دراز عجیب و غریب ملکوں کی باتصویر، تحیر انگیز، خوابناک کہانیاں نہیں۔ صرف مکتبی تعلیم، خواہ وہ کتنی بھی مکمل ہو، انسان کو تخیل کی بلند پروازیوں تک نہیں لے جا سکتی۔ جو ادیب سیاسیات اور نفسیات کے پہلے سے سوچے سمجھے خیالات یا تصورات یا نظریات کے مطابق بچوں کا ادب تخلیق کرتے ہیں (حالی اور اسماعیل میرٹھی کی طرح) وہ بھی بچے کو وہ حقائق دکھانے سے قاصر رہیں گے جو ایک ALICE "ونڈر لینڈ" میں کر کے دکھا سکتا ہے۔

دریں حالات یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بچپنے کے ضدی اور طبع زاد تخیل کو اپنی راہیں خود تراش لینے دو۔

---

itsurdu.blogspot.com

تعمیر ملک و ملت میں بچوں کے ادیب کا حصہ

صوفی تبسم

ایک ادیب بچے کے بارے میں کہتا ہے کہ بچوں کا نیند سے بیدار ہونا ایسا ہے جیسے ننھی کلیاں کھل رہی ہوں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی تازہ روحوں سے خوشبوئیں فضا میں پھیل گئی ہیں۔ پرندہ چہچہاتا ہے، بچہ تتلاتا ہے لیکن نغمہ ایک ہی ہوتا ہے۔ بہم، دھندلا، مدھم لیکن گہرے عمیق معانی میں ڈوبا ہوا لیکن پرندوں کے برعکس، بچے کے سامنے انسانی تقدیر کی وسیع اور گمبھیر وسعتیں ہوتی ہیں۔ بالغ انسان اس تصور کے پیدا ہوتے ہی بچوں کے مسکراتے ہوئے ننھے منھے سے اور ایک گہری سوچ میں کھو جاتا ہے۔

بچوں کے لبوں پر کھیلتی ہوئی مترنم آوازیں ایک نہایت ہی پاکیزہ اور مقدس نغمہ ہوتا ہے جو انسانی روح سے ابھر کر فضا میں گونجتا ہے لیکن بچے کی اس سادہ معصوم سی زبان اور مبہم سے لہجے میں ایک دبا ہوا احتجاج پنہاں ہوتا ہے ان ذمہ داریوں کے بوجھ کے خلاف جو آئندہ زندگی اس پر ڈالنے والی ہوتی ہے اس کی مسکراہٹ ان قوتوں کا اظہار ہوتی ہے جو وہ فطرت کی طرف سے جبلی انداز میں لیکر آتا ہے ان قوتوں کی فتح مندی کا اظہار جو اس کے دھندلے سے تصورات میں نمایاں ہوتی ہے۔

بچہ روحانی فضاؤں کے اثرات جلد ہی لے آتا ہے اور بقول ورڈز ورتھ سالوں تک ان روحانی فضاؤں میں کھیلتا، چلتا، پھرتا، لنگ و دوڑ کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ زندگی کی دشوار راہیں، تجربات کی شیریں تلخیاں اسے آہستہ آہستہ ان فضاؤں سے دور لے جاتی ہیں۔

فطرت کے اس منکر شاعر کا جو خیال بھی ہو سو ہو، روحانیت کسی مرحلے پر، زندگی کے میدان میں اس نوخیز اور نووارد مسافر کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتی۔ یہ اس امر کے ہمراہ طبیعتی اور زندگی کے نشیب و فراز میں اس کا سہارا بنتی رہتی ہے۔ اسی سے اس کی زندگی کے جسمانی اور مادی پہلو نشو و ارتقا حاصل کرتے ہیں اسی سے اس کی شخصیت کی تشکیل، تعمیر اور تکمیل ہوتی ہے۔ البتہ

اس کے لئے ایک موزوں اور سازگار ماحول درکار ہوتا ہے۔ یہ ماحول اسے ماں کی گود، گھر کی چار دیواری، درسگاہوں کی فضا اور سوسائٹی کا نظام عطا کرتا ہے جس میں یہ تمام چیزیں برابر کی شریک اور اسی لئے برابر کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ آج کا بچہ کل کا باپ ہوتا ہے اور اس لحاظ سے اس کی حیثیت خشتِ اول کی ہوتی ہے اور مثل مشہور ہے کہ

خشتِ اوّل چو نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

ظاہر ہے کہ کسی بڑی تعمیر کے لئے بنیاد کا مضبوط ہونا لازمی ہوتا ہے اور اگر خشتِ اول ہی کج ہو تو ثریا تک دیوار پہنچنے سے بہت پہلے ہی زمین پر آ گرتی ہے۔

لیکن بچہ صرف بنیاد ہی کی اینٹ نہیں ہوتا۔ یہ اینٹ دیواروں، منڈیروں اور محرابوں میں بھی لگتی ہے اسے عمارت کو صرف محکم کرنا نہیں ہوتا اسے زیبا، حسین و جمیل بنانا بھی ہوتا ہے بچہ خشت اول ہی نہیں خشت وسطی اور خشت آخر بھی ہوتا ہے اور اس اعتبار سے اس میں تمام صلاحیتیں اور استعدادیں بدرجہ اتم موجود ہونی لازمی ہیں۔

خشت اول کو درست رکھنا والدین کا کام ہے اسے دیواروں میں صرف کرنا اور کسی عظیم الشان عمارت کا بوجھ سہارنے کے قابل بنانا استادوں کا فرض ہے ان اینٹوں کی ساخت و پخت، ان کا سنوارپن، نکھار اور زیبائش اور آرائش، ان ہاتھوں کی قوت ہے جن کے بل پر فن، ادب اور شعر سنورتے ہیں اور جنہیں طرف خاص میں فنکار کہا جاتا ہے۔ فطری اور جبلی طور پر تمام فنون کا سرچشمہ ایک اور کم و بیش ان کا منصب بھی مشترک اور ایک ہی ہوتا ہے اگرچہ ان کے اظہار کے ذرائع اور نتائج الگ الگ ہوتے ہیں۔

ہر فن کی اپنی اپنی لطافتیں اور نزاکتیں ہوتی ہیں لیکن ان لطافتوں اور نزاکتوں کا فہم و افہام جبلی طور پر انسان کے لئے زیادہ آسان ہوتا ہے۔ کسی تعمیری شاہکار کا حسن بچے کی توجہ کو اپنی طرف ضرور کھینچتا ہے لیکن تصویر کی دل کشی اس کے ذہن اور ہاتھوں کی دسترس کے قریب تر ہوتی ہے۔ شعر و نغمہ اسے آسانی سے مسحور کر لیتے ہیں۔ کہانیاں انہیں لوریاں دیتی

itsurdu.blogspot.com

ہیں انہیں بھولا بھلاتی اور سلاتی ہیں ان تمام چیزوں کی اہمیت کی طرف بچہ تو درکنار اکثر بالغ لوگ بھی توجہ نہیں دیتے لیکن بچہ اسے سمجھے نہ سمجھے اس کا ننھا سا ذہن پوری مستعدی اور ہوشمندی کے ساتھ ان سے متاثر ہوتا چلا جاتا ہے۔

وہ ننھا سا بچہ جو کسی انڈے کے خول یا شکم مادر میں محصور ہو، کبھی اس سادہ سی دیکھ بھال نگہداشت اور پرورش کو نہیں سمجھ سکتا جو اسے ایک آنیوالی عظیم زندگی کے لئے تیار کر رہی ہو، اس کے لئے اس تمام کاروبار حیات کے اہتمام کا تصور کرنا بھی محال ہے اور اگر فطرت یہ احساس شعوری طور پر بچے میں نہ بھی پیدا کرے تو اس کا احساس بیداری اور اس کا شعور میں جنم لیتا ہے کیونکہ ان کا یہی منصب ہے اور یہ بڑے سوسائٹی کے افراد ہیں، والدین، اساتذہ، فن کار اور ادیب بھی شامل ہیں اور یہ لوگ اپنے فرائض منصبی کے اعتبار سے زیادہ ذمہ دار ہیں۔

میں نے والدین، اساتذہ، فن کار اور سوسائٹی کے دوسرے اہم افراد کو جو بچوں کی زندگی سے دور یا نزدیک سے وابستہ ہوتے ہیں۔ قطع نظر کر کے اپنے مضمون کو بچوں کے ادیب تک محدود رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ ادیب میں شاعر بھی شامل ہیں۔ کیونکہ شعر آخر ادب ہی ہوتا ہے۔

شاعر یا ادیب کو زندگی کا ترجمان کہا جاتا ہے۔ زندگی کا لفظ بڑا وسیع ہے اور اس کی معنوی آفاقیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ شاعر اور ادیب کی نظر کائنات کے ہر گوشے پر پڑتی ہے لیکن ایسی دور رس نظریں رکھنے والا انسان اپنے قرب و جوار سے کیونکر آنکھیں بند کر لیتا ہے وہ جہاں عالمگیر انسانی برادری سے رشتہ جوڑتا ہے وہاں اسے گھر والوں کی طرف توجہ کرنا بھی لازمی ہوتا ہے ہر نیک کام کرنے کے لئے پہلے خویش اور پھر درویش کی ترتیب قائم رہتی ہے اپنے ملک اور اپنی ملت کا حق فائق ہوتا ہے اور جو اپنے حقوق نہ پہچانے وہ دوسروں کی کیا خدمت کر سکے گا۔

کوئی کام سرانجام دینا ہو اور وہ کتنا ہی مختصر اور آسان کیوں نہ ہو، اس کے لئے پوری تندہی اور جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر کام کے ہزاروں پہلو ہوتے ہیں۔ کوئی فرد واحد ان تمام پہلوؤں پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ ہر کام کے لئے تقسیم کار کی ضرورت پڑتی ہے۔

ایک گھر میں ایک بچے کو دیکھئے۔ ماں اسے گودوں کھلاتی ہے۔ باپ اس کی آسائش کے سامان مہیا کرتا ہے۔ بہن بھائی اس کے ساتھ کھیل کر میٹھی میٹھی باتیں کر کے اس کا دل لبھاتے ہیں۔ آیا اس کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ بوڑھی اماں کہانیاں سناتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کنبے کا کوئی واحد فرد یہ تمام کام نہیں سنبھال سکتا اس کے لئے سب کا مل کر اپنی اپنی استعداد اور اپنے اپنے منصب کے مطابق اٹھانا لازمی ہوتا ہے اسی طرح کوئی ایک ادیب تنہا یہ کام سرانجام نہیں دے سکتا۔ کسی ایک اکیلے شاعر کے بس کا روگ نہیں اس کام کے لئے سب کا متفقہ طور پر مل کر کام کرنا فرض ہے۔

ماں باپ اور گھر والے زیادہ تر بچے کی جسمانی نشوونما کے ضامن ہوتے ہیں استادوں کا کام علم کے ذریعے انھیں بصیرت عطا کرتا ہے۔ ادیب کا منصب ان کے ذہنوں کو جلا دیتا ہے۔ یہ ذہنی تربیت انسانی کردار اور شخصیت کی تعمیر کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔

گھر والے خون کے رشتے کی وجہ سے بچے سے قطع نظر نہیں کر سکتے اساتذہ کی دل چسپی پیشہ ورانہ ہی کیوں نہ ہو۔ دل چسپی ضرور ہوتی ہے لیکن ایک ادیب اور شاعر کے لئے یہ فرض شناسی اس کے وسیع منصب سے آشنا ہوتا ہے اور وہ منصب سب سے پہلے ایک انسانی منصب ہے اور پھر قومی اور ملی منصب کہ جس کا احساس و شعور خود اس کی اپنی زندگی سے وابستہ ہے جس طرح گھر والے، کھلونوں سے چل کر مناسب غذا، عمدہ لباس اور دوسرے سامان سہولت و آسائش مہیا کرتے ہیں اسی طرح شعرا اور ادیب بھی اپنی اپنی استعداد اور مطمح نظر اور عمق فکر کے انداز میں یہ ذہنی کھلونے، یہ سامان تفریح یہ لوازمات تربیت بہم پہنچا سکتی ہیں۔

بی چوں، چی چوں چاچا
گھڑی پہ چوہا ناچا
گھڑی نے ایک بجایا
چوہا نیچے آیا

itsurdu.blogspot.com

کی بظاہر بے معنی نظم سے لے کر سے

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

تک اور چڑیوں، چوہوں، بلیوں، جنوں اور پریوں اور دوسری مافوق الفطرت کہانیوں سے چل کر پر معنی اور عبرت خیز افسانوں تک سب کے سب ضروری ہیں یہ سب بچوں کے کھلونے سہی لیکن مختلف عمر کے بچے، اپنی اپنی استعداد اور ذہنی سطح کے مطابق ان مختلف کھلونوں سے اپنی کائنات آباد کرتے ہیں۔ یہ ان کی تفریحی دنیا ہوتی ہے اور اس کا ایک تربیتی پہلو بھی ہوتا ہے کوئی کھیل محض کھیل نہیں اور کوئی تفریح فقط تفریح نہیں ہوتی، کوئی بے معنی نظم کوئی فرضی قصہ، کوئی پریوں کی داستان مقصد کے حصول سے خالی نہیں رہ سکتی بچے اس کا اظہار پورے طور پر کر سکیں لیکن ان کی توجہ وابستگی اور انہماک ان کی آنکھوں کی چمک اور لبوں کی مسکراہٹ سے ظاہر ہو جاتا ہے اور بچوں کا یہ طبعی تاثر اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مناسب اور موزوں طریق سے مستفید ہو رہے ہیں۔

ایک چھوٹا بچہ ٹیلی ویژن پر ایک معروف موسیقار کا گانا سن رہا تھا۔ غزل تھی لیکن دھن کلاسیکی انداز کی تھی۔ گانے والی اپنی دل کش آواز کے ساتھ اپنے حسین بازوؤں اور ہاتھوں کے سُر ملا رہی تھی، اچانک بچہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی پیشانی پر شکن پڑی ہوئی تھی۔ پوچھا گیا۔ صاحبزادے کیا ہوا، اٹھ کھڑے ہوئے ہو۔ بے ساختہ بولا ہونہہ، یہ گانے سے زیادہ کرتی ہے۔

بچہ بہت چھوٹا تھا نہ لفظوں کی نزاکت پہچانتا تھا نہ اسے سُر تال کی خبر تھی لیکن اس کا طبعی شعور بدستور کام کر رہا تھا۔ موسیقی مجموعی طور پر اپنا اثر دکھا رہی تھی اور اسے موسیقار کے بظاہر بے معنی بلتے ہوئے ہاتھ موسیقی کی اس اثر انگیزی میں حائل ہوتے محسوس ہو رہے تھے بچوں کا اشیاء کا ادراک اور ان کا شعور بڑوں سے کہیں زیادہ تیز ہوتا ہے اور وہ اس سے پورا اثر لیتے ہیں اور ہر تاثر ان کی زندگی میں سرایت کر کے اس کی تشکیل میں ایک زبردست محرک کا کام دیتا ہے۔ اسی تیز تاثر سے فائدہ اٹھانا اور اسے درست راہ پر لگانا ایسی ہی

ہستی کا کام ہے جو خود اس تاثر کا پتلا ہے اور وہ ادیب و شاعر ہے۔ گھر والے ننھے بچوں کو کھلونا سمجھیں تو سمجھیں اور ان سے اکتا کر انہیں الگ پھینک دیں یا نہایت بے رحمی سے توڑ ڈالیں تو اور بات ہے لیکن ایک زبردست شعور کا مالک شاعر اور ادیب یہ نہیں کر سکتا۔ اس کے نزدیک یہ کھلونے تو زندہ کردار ہیں۔ یہ بچے تو اس کی نظروں میں بالغوں کی طرح چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں اس کی آواز اور اس کے اشاروں کو، وہ کتنے مبہم کیوں نہ ہوں، پہچانتے اور سمجھتے ہیں۔

بچے بھی ان کی زبان اور قلم سے نکلے ہوئے ان الفاظ میں زندہ کرداروں کو دیکھنے کی اہلیت رکھتے ہیں اس لئے وہ ان کی طرف اسی توجہ سے دیکھتے ہیں۔ جس طرح وہ زندہ مخلوق کو۔

ان حالات کے پیش نظر یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ کوئی ادیب یا شاعر خواہ وہ کتنا ہی عظیم ادیب اور شاعر کیوں نہ ہو، بچوں کو محض کھلونے سمجھ کر انہیں درخور اعتنا نہ سمجھے اور انہیں مخاطب کرنا اپنی کسر شان سمجھتا ہو۔

ادب و شعر کی سحر انگیزیوں سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ تاریخ عالم کے اوراق گواہ ہیں کہ شعراء اور ادیبوں نے اپنی نظموں اور تحریروں سے قوموں میں بڑے بڑے حیرت انگیز انقلاب پیدا کئے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ انقلاب انگیزی صرف بالغوں اور بڑوں، بڑھوں اور جوانوں کی بیداری کا باعث تھی۔

خیال کیجئے کہ وہ بچے جن کے ننھے کانوں میں ادبی شاہکاروں کی گونج پڑی ہو گی۔ اور جن کو معصوم اور سادہ آنکھوں نے بڑوں کے جوش عمل کو دیکھا ہو گا وہ اس سے کیونکر اثر قبول کئے بغیر رہے ہوں گے آخر اپنے بڑوں اور بزرگوں کے نتائج اعمال کو سنبھالنے والے یہی ننھے منے ہی تو تھے جنہوں نے ان کی جانشینی کا حق ادا کیا۔ گزشتہ سال بھارت اور پاکستان کی جنگ میں قومی ترانوں، تقریروں اور دوسرے ادبی مظاہروں یہاں تک کہ خبروں کے نشریہ انداز نے ہمارے بچوں میں کس قدر قومی اور ملی شعور بیدار کیا تھا آخر یہ سب کچھ ہمارے شاعروں اور ادیبوں کے کارنامے تھے جن کارناموں کا جاری رہنا دوسری شکل میں یہی آج بھی ممکن اور ضروری ہے ؎

itsurdu.blogspot.com

بچوں کا ادب

جناب ممتاز حسن

ورڈزورتھ نے کہا تھا ــــــ "بچہ انسان کا باپ ہے" ــــــ اگرچہ اپنے لئے خود اپنے باپ ہونے کا تصور ایک غیر معمولی سا خیال معلوم ہوتا ہے لیکن اس مشاہدے کی سچائی میں کوئی کلام نہیں۔ انسان کی ذہنی اور اخلاقی تشکیل میں اہم ترین عنصر یہ ہوتا ہے کہ ایک بچے کی حیثیت سے اس نے کس طرح تربیت پائی؟ کس قسم کے ماحول میں وہ پلا بڑھا؟ کس قسم کے لوگوں سے وہ ملا جلا اور لوگوں نے اس سے کس قسم کا سلوک کیا۔ ایک عرب شاعر کے الفاظ ہیں:

كَذَا مَنْ عَاشَرَ الْعُلَمَاءَ طِفْلاً يَكُوْنُ إِذَا نَشَأَ شَيْخاً أَدِيْبا۔

"جس شخص کو بچپن ہی سے علماء کی صحبت میسر آجائے وہ بڑھ کر ایک عالم و فاضل ہی بنے گا۔"

یا بقول سعدی:

گل خوشبوی در حمام روزی — رسید از دست محبوبی بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری — کہ از بوی دلآویز تو ہستم
بگفتا من گل ناچیز بودم — ولیکن مدت با گل نشستم
جمال ہمنشین در من اثر کرد — وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

ایک روز حمام میں مجھے ایک دوست نے ایک خوشبودار مٹی کا ٹکڑا دیا میں نے پوچھا کہ لے گل تجھ سے ایسی دلآویز خوشبو آرہی ہے کہ میں مدہوش ہو رہا ہوں۔ بھلا بتا کیا تو مشک ہے یا عبیر؟ بولا میں تو ناچیز مٹی ہوں لیکن مدت تک مجھے گل سے قربت رہی ہے۔ میرے ہمدم کا حسن دلنشیں

میرے اندر سرایت کر گیا ہے۔ ورنہ میں تو خاک کا ایک حقیر سا ٹکڑا ہوں"۔

سعدی کے تودہ گل کو تو خوشبو محض گل کے قرب سے حاصل ہوئی تھی۔ لیکن کتابیں حقیقی معنوں میں ہمدم و مساز ہوتی ہیں۔ اور انہیں پڑھ کر گویا ہم ان سے ہمکلامی کا شرف حاصل کر لیتے ہیں۔ کتاب مصنف کے خیالات کا نچوڑ ہوتی ہے۔ جنھیں مصنف اپنے قارئین تک پہنچاتا ہے۔ ادب کی یہی اہمیت ہے۔

بچے انسانی معاشرے میں سب سے زیادہ اثر پذیری کی قوت رکھتے ہیں۔ ان پر جو اثرات ابتدا میں مرتب ہوتے ہیں وہ ساری عمر قائم رہتے ہیں۔ اس لئے بچوں کا ادب معاشرے کے مستقبل پر گہرے اثرات رکھتا ہے۔ فرائیڈ بچے کے لئے دنیا ایک بہت بڑا حیرت کدہ ہوتی ہے۔ یا ولیم جیمز کے مشہور الفاظ ہیں: "ہنگامہ ہاؤ ہو کا مسکن ہے" ــــ جوں جوں بچہ بڑا ہوتا جاتا ہے اور جادۂ حیات میں گرم سفر ہوتا ہے تو وہ پہلے اس الجھاوے کو دور کرتا ہے اور اپنے گرد و پیش کے انتشار اور بے ہنگمی کے درمیان ایک خاص انداز کی تربیت پیدا کرنا شروع کر دیتا ہے وہ خود اپنی ضروریات سے آگہی حاصل کرتا ہے اور ان لوگوں کی طرف بڑھتا ہے جو ان ضروریات کو پورا کرنے میں اس کے ممد و معاون ہوتے ہیں۔ جیسے جیسے وہ زندگی کی منزلیں طے کرتا جاتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ اپنے ماحول سے واقف ہونے کا جویا رہتا ہے اور اپنے مفادات خاص کی خاطر اپنے ماحول کو اپنے دست قدرت سے تابع کرنا چاہتا ہے۔ اس کے ذہن کے ساتھ اس کا جسم بھی بڑھتا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ عموماً ذہن جسم سے کہیں زیادہ آگے جا پہنچتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ذہن و جسم دونوں صحت مند اور توانا ہوں۔

بچہ کو جس سماج میں وہ پیدا ہوتا ہے اس میں اپنے مقام کا ادراک ہوتا ہے۔ اور اس بصیرت خاص کے حصول میں اس کے والدین اور استادوں کو پوری مدد دینا چاہیئے۔

کتابیں بشرطیکہ انھیں مناسب طور پر لکھا اور شائع کیا گیا ہو۔ بچوں کی شخصیت کو نکھارتی اور سنوارتی ہیں۔ بنی نوع انسان کے عظیم کارناموں کو جاننے اور بیرونی

itsurdu.blogspot.com

دنیا سے آگہی حاصل کرنے کی جو بھوک ان کے اندر ہوتی ہے، اس کی تشفی کا سامان کتابوں ہی میں ہوتا ہے لہٰذا وہ تمام معلومات اور واقعات جیسے عظیم دریافتیں، مہم جوئی کے قصے، عظیم انسانوں کے حالاتِ زندگی اور تاریخی واقعات ان کے تخیل کو توانائی اور قوت بخشتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ جو نصابی کتابیں بچوں کے لئے منظور کی جائیں ان کے ساتھ پڑھنے کی عمومی کتابوں کو بھی شامل کیا جائے تاکہ تعلیم و تربیت کا مرحلہ بچوں کے لئے دلچسپ اور قابلِ قبول بن سکے۔

جب ہم بچوں کے ادب پر جو ہمارے ملک میں پیدا کیا جا رہا ہے، نظر کرتے ہیں تو ہمیں اس سے بڑی آزردگی اور بے اطمینانی ہوتی ہے۔ خاص کر اردو میں بچوں کے لئے جو ادب پیدا ہو رہا ہے اسے دیکھ کر شدید مایوسی ہوتی ہے۔

یہ بات حکومت برطانیہ کی خوبیوں کی صف میں گنی جائے گی کہ اس نے اس مسئلہ پر خاطر خواہ توجہ دی، اس نے بچوں کا ادب تصنیف کرنے کے لئے، مقامی باصلاحیت لوگوں کی جستجو اور تلاش کی۔ جو لوگ ان کی توقعات پر پورے اترے ان کی اس نے ہر طرح سے حوصلہ افزائی کی۔ اس میں مالی منفعت سے ترغیب و تحریک بھی شامل تھی۔ اس وقت حکومت برطانیہ کے ان مصالح سے ایک بھرپور بچوں کا ادب معرضِ وجود میں آ گیا۔ سابق پنجاب میں ڈاکٹر ایڈ جیسے لوگوں نے بچوں کے قاعدے اور ابتدائی کتابیں وغیرہ، مولانا محمد حسین آزاد جیسی عظیم ادبی شخصیتوں سے لکھوا کر شائع کیں۔ یہ وہ وقت تھا جب حالی۔ اسماعیل میرٹھی۔ سورج نرائن مہر اور تلوک چند محروم جیسے دانش وروں نے لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے آسان اور اخلاق آموز نظمیں لکھیں۔

اسی زمانے میں نذیر احمد نے چند پند اور منتخب الحکایات لکھیں ..... بچوں کے لئے تو جناب اقبال جیسے عظیم شاعر نے بھی نظمیں لکھیں جو آج بھی مقبول ترین سمجھی جاتی ہیں۔

سید ممتاز علی صاحب نے بچوں کا مشہور ہفت روزہ اخبار پھول لاہور سے جاری کیا جس کے خریدار تمام برصغیر میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس اخبار کے عملہ ادارت سے بڑی

شاندار اور معروف شخصیتیں جیسے عبدالمجید سالک۔ ہری چند اختر اور غلام عباس وغیرہ وابستہ رہی ہیں۔

اس اخبار نے ایک تاریخ کو جنم دیا اور بہت سے اعلیٰ صلاحیتوں کے ادیب اس کے صفحات سے وابستہ رہے اور اس کا پیدا کردہ بچوں کا ادب بہت زیادہ مقبول ہوا۔ اخبار "پھول" کے علاوہ سید ممتاز علی صاحب کے دارالاشاعت نے بچوں کے لئے بہت سی مفید کتابیں بھی شائع کیں۔

اردو کے مشہور ادیب راشد الخیری دہلوی کے اپنے ادارے عصمت بکڈپو نے بھی بچوں کے ادب کی گرانقدر خدمات انجام دیں۔ اس بکڈپو نے بچوں اور خصوصاً لڑکیوں کے لئے بہت سی مفید کتابیں شائع کیں، اسی طرح اور بھی بہت سے مصنفین اور اشاعت گھروں نے جیسے پیسہ اخبار بکڈپو (جس کا ایک ہفت روزہ بچوں کا اخبار نامی شائع ہوتا تھا) نے بھی بڑی مفید خدمات بچوں کے ادب کی انجام دی ہیں۔

مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پوری روایت کا خاتمہ یہیں ہو کر رہ گیا۔ ہمارے اپنے زمانے کا عالم یہ ہے کہ حفیظ جالندھری۔ احمد شاہ بخاری۔ حکیم احمد شجاع۔ امتیاز علی تاج حفیظ ہوشیارپوری۔ غلام عباس۔ مسلم ضیائی۔ شفیع الدین نیّر اور ایک آدھ نام کے علاوہ جس نے اعلیٰ درجہ کا ادب پیدا کیا ہو، بچوں کے کسی اور ادیب کا نام ذہن میں نہیں لا سکتے۔ قومی کتاب مرکز پاکستان نے حال میں ہی کراچی سے اردو زبان میں بچوں کی کتابوں کا ایک قاموس شائع کیا ہے۔ جس کے متعلق مجھے خدشہ ہے کہ یہ متوقع معیار پر پورا نہیں اترا۔

برطانوی عہد میں بچوں کے لئے جو کتابیں شائع ہوئی تھیں وہ اب فرسودہ اور کہنہ ہو چکی ہیں۔ مثال کے طور پر محمد حسین آزاد کی تصنیف کردہ پہلی کتاب ہی کو لیجئے۔ اس کتاب میں آڈیارڈ کپلنگ کے والد نے تصویریں چھاپنے کے لئے لکڑی کے بلاک بنائے۔ کتاب کی تصویروں میں ایک تصویر میں ایک چھوٹا سا بچہ اپنی ماں کی گود میں دکھایا گیا ہے اور اس کے پاس ہی باپ بیٹھا حقہ پی رہا ہے۔

دیہات کے اس مخصوص سین کے متعلق ہم خواہ کتنے بھی جذباتی کیوں نہ ہو جائیں مگر یہ

itsurdu.blogspot.com

کے ساتھ اختیار کیا جانا ضروری ہے۔ پانچ یا چھ سال کے بچوں کو ڈاکٹر منٹسوری نے انجذابی ذہن اور بعد کی عمر کے بچوں کو شعوری ذہن قرار دیا تھا۔

ظاہر ہے کہ ۵/۶ سال کی عمر کے بچوں کے لئے جو کتابیں لکھی جائیں گی وہ بڑے بچوں کی کتابوں سے مختلف ہونگی، اس تفریق کے ساتھ ساتھ ہمیں درسی اور عمومی کتابوں میں بھی امتیاز کرنا پڑے گا۔ جہاں تک درسی کتابوں کا تعلق ہے حکومت اور نصابی کمیٹیوں نے ان کی ذمہ داری اپنے کندھے پر لے لی۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ملک میں جتنے بھی بہترین لکھنے والے ہیں ان کو ایک خاص طریقے پر اس مقصد کے لئے جمع کیا جائے کہ وہ ۱۱ سال کی عمر کے بچوں کے لئے نئی درسی کتابیں تصنیف کریں۔

چھوٹے بچوں کی درسی کتابوں میں زیادہ سے زیادہ رنگین تصاویر کا ہونا ضروری ہے پھر نثر بھی ہونی چاہیئے اور شاعری بھی، نظموں کو بہت مختصر ہونا چاہیئے تاکہ انہیں آسانی سے حفظ کیا جا سکے اور یاد رکھا جا سکے۔

ایک نظم عام طور پر پانچ، چھ مصرعوں کی زیادہ نہیں ہونی چاہیئے۔ انگریزی کی درسی کتابوں کی نظمیں اس سلسلے میں بہترین مثال کے طور پر سامنے آتی ہیں۔ ہمیں خوفناک اور ڈرانے والی کہانیاں کے انتخاب میں خاص طور پر محتاط ہونا پڑے گا۔ گرم (GRIMM) اور اینڈرسن جیسے عظیم ادیبوں کی بچوں کی جنوں اور پریوں کی کہانیاں بھی احتیاط سے منتخب کرنی چاہئیں۔ وہ اپنی جگہ بلاشبہ کلاسیکی تخلیقات ہیں۔ لیکن اگر صحیح انتخاب نہ کیا جائے تو بعض کہانیاں بچوں کے ذہن پر غلط اثر بھی چھوڑ سکتی ہیں۔

میں تو یہاں تک کہنے کی جسارت بھی کرتا ہوں کہ جدید کامکس (COMICS) چند ایک کو چھوڑ کر بچوں کے ذہن پر بُرا اثر ڈالتے ہیں۔ یہ مہم جوئی کی کہانیوں کے پردے میں خوف و ہراس پیدا کرتے ہیں، بجائے اس کے کہ بچوں کے صحت مند اور توانا نقطہ نظر پیدا کریں۔ یا تو انہیں زندگی اور دنیا کا مقابلہ کرنے کی جھجک پیدا کرتے ہیں یا زندگی کا ایک اذیت پسندانہ اور جنون خیز طرز عمل پیدا کرتے ہیں۔

بچوں کی کتابیں لکھنے کے لئے اچھے اور باصلاحیت مصنفین کا انتخاب ایک بہت

ماننا پڑے گا۔ کہ اس قسم کی تصاویر کا رواج اس صدی کے اختتام تک جب یہ کتابیں لکھی گئی تھیں عام تھا، لیکن آج اس انداز کی تصویروں کا رواج نہیں رہا ہے۔ ہم ایک مختلف دنیا میں رہ رہے ہیں۔ اور پورا کا پورا ماحول یکسر بدل گیا ہے۔ حتیٰ کہ دیہی علاقوں تک میں سادہ اور قدیم طرز بود و باش بدل گیا ہے۔

کچھ کوششوں سے اس بات کی بھی کوششیں کی گئی ہیں کہ بچوں کی کتابوں کو جدید انداز میں پیش کیا جائے لیکن ان کوششوں کو سفر بالجبر ہی قرار دیا جائے گا اور اس کے کوئی مفید اور موثر نتائج برآمد نہیں ہوئے۔

ان اسکولوں میں جہاں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے جو کتابیں مروج ہیں وہ ہمارے سماجی ماحول سے مطابقت نہیں رکھتیں یہ ہمارے بچوں کے ذہنوں پر یورپ کی معاشرت اور خیالات کو بے تکے پن سے ٹھونسنے کا موجب بنی ہوئی ہیں، ان کتابوں کو یوں سمجھئے کہ ہمارے بچے پانی کی طرح پی تو لیتے ہیں مگر اس سماجی نتائج بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ اس روش سے ایک ایسی نسل کو معرض وجود میں لایا جا رہا ہے جس کی حیثیت اپنی ہی سماج میں اجنبی کی سی ہے یہ نسل اکثر اپنی پوری زندگی سماج سے اپنی عدم مطابقت ختم کرنے اور اس سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش میں ذہنی اور روحانی کرب میں گزار دیتی ہے۔

مجھے یورپی خیالات اور افکار کے خلاف کوئی اعتراض نہیں ہے حقیقت تو یہ ہے کہ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کے علوم و فنون حاصل کریں۔ مجھے اعتراض اس وقت ہوتا ہے جب بیرونی خیالات ہمارے بچوں کے ناپختہ ذہنوں میں داخل کئے جاتے ہیں اور یوں معاشرتی ماحول کے حوالے سے ان کی شخصیت میں عدم توازن پیدا ہوتا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، بیرونی خیالات کے اکتساب و انجذاب میں انتہائی احتیاط سے کام لیا جائے اور ان بیرونی خیالات و تصورات کو تعلیم کی دوسری منزلوں کے لئے چھوڑ دینا چاہیئے۔

اگر ہمارے پاس بچوں کی اچھی کتابیں نہیں ہیں تو قصور ہمارا اپنا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ بلا تاخیر بچوں کے لئے نئی درسی کتابیں اور عام مطالعے کی کتابیں لکھنے کا کام تیزی

itsurdu.blogspot.com

ہی پیچیدہ اور مشکل مسئلہ ہے۔ کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ یوں تو ایسی کتابیں لکھنے کے لئے خود کو پیشہ ورانہ طور پر وقف کر دیتے ہیں لیکن ویسے کوئی کام کی چیز لکھنے کی اہلیت نہیں رکھتے اس کے برعکس سوفٹ جیسے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ جس نے گلیورز کے سفر کے دلچسپ واقعات کی صورت، اپنے وقت کی زندگی کے بعض پہلوؤں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بچوں کے لئے بھی انتہائی دلچسپ اور دلکش کتاب بن گئی۔ کپتان گلیور لی پٹ کے جزیرے میں جاتا ہے تو وہاں کی ایک ایک بات بچوں کا دل لبھاتی ہے لیکن جب وہ یاہوس کی سرزمین پر پہنچتا ہے تو یہ مسائل بڑوں کے لئے ہیں بچوں کے لئے نہیں۔

اس سلسلے میں ایک اور بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ سائنس کو عام طور پر ایک خشک اور مشکل مضمون سمجھا جاتا ہے لیکن جولیس ورن جیسے صاحب طرز لوگوں نے سائنس کے موضوعات کو بالکل پانی کر دیا اور مہماتی کہانیوں کی طرح دلچسپ اور پُرجوش بنا دیا۔

یومیس کیرول نے ایک ننھی بچی کا دل بہلانے کے لئے دو کہانیاں "ایلیس ان ونڈر لینڈ" اور "ایلیس ان دی کونگ گلاس" لکھیں۔ لیکن ان کہانیوں میں سائنس اور ریاضی کے بڑے بڑے فارمولے اور حقائق ہنسی ہنسی میں بیان کر دیئے ہیں۔ چنانچہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ سر آرتھر اڈنگٹن جیسے عظیم المرتبت سائنس دان بھی اپنے اہم اور تخلیقی مقالات میں ایلیس کے حوالے اور اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دن ہمارے یہاں بھی ایسے ذہین و فطین لوگ ہمیں بچوں کے اساتذہ کے روپ میں ملیں گے۔ جو انتہائی قلیل تنخواہ پانے کے باوجود بچوں کی صحبت میں خود کو خوش و خرم رکھنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ ویسے یہ ضروری نہیں ہے کہ بچوں کی کتابوں کے مصنف لازمی طور پر بچوں کے اساتذہ ہی ہوں گے وہ بڑوں کے ادیب اور انشا پرداز بھی ہو سکتے ہیں۔

انگریزی زبان کے مشہور شاعر رابرٹ لوئیس اسٹیونسن اور ادیب سر جیمز بیری بڑھاپے میں بھی بالکل بچے بنے رہتے تھے اور انہوں نے بچوں کے لئے جو کچھ لکھا وہ آج تک دلچسپی کا سامان رکھتا ہے۔

اب تک جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس کا تعلق اردو زبان سے ہے افسوس کہ میں

بنگالی زبان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن میری اطلاع یہ ہے کہ وہاں حالات بہتر ہیں یہ دوسری بات ہے کہ اردو کی طرح کافی اصلاح اور اضافے کی ضرورت ہے۔

بچوں کی کتابوں کے سلسلے میں برطانیہ امریکا اور جرمنی جیسے ترقی یافتہ ممالک ہم سے بہت آگے ہیں۔ جان ڈیوی جیسے مربے کے فلسفیوں نے تعلیم اور تعلم کے مسائل پر بہت غور و فکر کیا ہے۔

پستالوزی جیسے عظیم مفکرین نے اپنی پوری زندگیاں تعلیم اور بالخصوص بچوں کی تعلیم پر وقف کی ہیں۔ اسلامی دنیا میں بھی کئی ممالک ہم سے آگے ہیں۔ ایران، مصر اور لبنان تین ملکوں کی طرف اشارہ کرنا کافی ہے وہاں بچوں کی کتابوں کا تصنیفی معیار ہم سے بلند ہے اور حسن طباعت کے اعتبار سے بھی ان کی کتابیں عمدہ تر ہیں۔

اگر اس امر سے اتفاق ہو جائے اور میرا خیال ہے کہ ہونا ہی چاہیئے کہ بچوں کے لئے ان کی عمروں کا لحاظ کرتے ہوئے نئی درسی کتابیں اور عمومی کتابیں کن خطوط پر لکھی جائیں؟

مادام مانٹیسوری نے بچوں کو پڑھانے کے لئے ایک طریقہ ایجاد کیا تھا (یاد رہے کہ موصوفہ کا تعلق تین اور چھ برس کے درمیانی عمر کے بچوں سے تھا) اس طریقے کے مطابق کوشش کی جاتی ہے کہ بچے کے ذہن کے سامنے پوری دنیا حسات صات عیاں ہو جائے۔ وہ یقین رکھتی تھیں کہ نوزائیدہ بچہ ازل ہی سے شعور اور انفرادیت رکھتا ہے اور یہ کہ تعلیم صرف اسی چیز کا نام نہیں ہے کہ اس پر کچھ بیرونی پابندیاں عاید کر دی جائیں، بلکہ تعلیم یہ ہے کہ دنیا کو مشاہدے سے جو علم حاصل ہوا ہے اس کے اظہار میں مدد دے، دوسرے ملکوں میں بھی کم و بیش ایسے ہی طریقے رائج ہیں۔

مثال کے طور پر جرمنی میں، فروبل کا کنڈر گارٹن سسٹم مروج ہے جس کا منشا یہ ہے کہ بچے کے ذہن کو ازخود اور فطری طور پر نشوونما پانے میں مدد دی جائے۔ میرے خیال میں پاکستان میں بچوں کی کتابوں میں مندرجہ ذیل عناصر کی شمولیت ضروری ہے۔

بالخصوص تمام درسی کتابوں میں یہ عناصر لازمی طور پر اور زیادہ سے زیادہ حد تک شامل کئے جانے چاہئیں۔ بچوں کی درسی کتابوں کا پہلا لازمہ کہ خدا اور رسولؐ کا حوالہ دیا

itsurdu.blogspot.com

جائے۔ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے ہم اپنے عقیدے کے لئے جیتے اور مرتے ہیں اردو یا بنگالی کے مطالعہ کے لئے جو درسی کتابیں مقرر کی جائیں انھیں حمد اور نعت کی صورت میں مختصر اور سادہ نظمیں شامل کی جائیں جن کو بہ سہولت حفظ کیا جا سکے۔ دوسرے مذاہب کے عظیم بانیوں کا حوالہ بھی ہونا چاہیئے۔

اس کے بعد پاکستان کی تاریخ اور جغرافیے کے بارے میں کچھ معلومات دی جائیں اور اس کے تین عظیم معماروں سید احمد خاں، علامہ اقبال اور قائداعظمؒ کا بھی مناسب تذکرہ موجود ہو۔ دوسرے لوگ بھی جنہوں نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کا تذکرہ بھی شامل ہونا چاہیئے۔

ان بنیادی تقاضوں کے بعد سائنس اور سائنس دانوں پر توجہ دینی چاہیئے۔ بچوں کو چھوٹی عمر ہی کے سائنس اور ریاضی سے واقفیت ہو جانی چاہیئے۔ ان کو اختصار کے ساتھ سائنس دانوں اور بالخصوص عظیم مسلمان سائنس دانوں کے سوانح اور کارنامے بتانے چاہئیں اور یہ تو ظاہر ہے کہ اگر وہ سائنس سیکھنا چاہتے ہیں تو پہلے انھیں سچ بولنا سیکھنا چاہیئے۔ آخر میں شہریت کے بھی کچھ اصول شامل ہونے ضروری ہیں۔ مثلاً شخصی حفظان صحت، قومی حفظان صحت، دوستوں کی صحبت اور حتیٰ کہ ٹریفک کے قواعد اور ضوابط بھی ضروری ہے کہ بچوں کو ان کی صحت ورزش اور سماجی خدمت کی اہمیت معلوم ہو۔ وہ دوسروں کا اور جانوروں کا بھی خیال رکھنا سیکھیں۔ سب سے زیادہ یہ کہ ان کو انسان کی عظمت اور وقار کا بھی علم دینا چاہیئے۔

ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ دوسروں کی عزت کریں اور اپنی عزت کرائیں اور اس چیز کا اطلاق خصوصیت کے ساتھ والدین، اساتذہ، بہن بھائیوں اور دوستوں پر ہوتا ہے کسی بھی نظام تعلیم کی قدر و قیمت اس وقت تک امتیاز حاصل نہیں کرتی۔ جب تک کہ وہ دوسروں کی عزت کرنے کی تعلیم نہیں دیتا۔

ایک بار پھر میں اس بات کو دہراؤں گا کہ اس انداز کی کتابیں، جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں، لکھنے کے لئے ملک کے بہترین مصنفین کا انتخاب کیا جائے اور ایک بہت

اعلیٰ سطح کی کمیٹی اس انتخاب کے لئے یا تو حکومت کی طرف سے مقرر ہو یا علمی ادارے اور تنظیمیں مل کر ایسی کمیٹی کی تشکیل کریں۔

یہ بھی ایک بنیادی سی بات ہے کہ کتابوں کی قیمت اتنی کم ہونی چاہیئے کہ غریب سے غریب لوگ بھی انہیں خرید سکیں۔ اگر ضروری ہو تو قیمت کو کم کرنے کے لئے حکومت کی جانب سے امداد بھی دی جائے۔

اگر کتابیں زیادہ تعداد میں چھاپی جائیں تو قیمت خود بخود کم ہو جائے گی اور کسی مالی امداد کی ضرورت نہیں رہے گی۔

آخر میں یہ کہوں گا کہ بچوں کی درسی کتابیں لکھنے کے لئے مصنفوں میں ترغیب و تحریک پیدا کرنی چاہیئے۔ ہمارے ہاں ادب کے لئے آدم جی اور داؤد کے انعامات ہیں۔ سائنس اور معاشیات کے لئے نیشنل بنک کا انعام ہے۔

لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، کوئی انعام بچوں کی کتابوں کے لئے نہیں ہے۔ نیشنل بک سنٹر دو انعامات ایک اردو اور دوسرا بنگالی زبان میں چھپنے والی بچوں کی کتابوں پر دیتا ہے۔ لیکن یہ انعام ان کی خوبصورتی اور دیدہ زیبی کے لحاظ سے دیئے جاتے ہیں۔ میرے خیال میں رائٹر گلڈ کو بلا تاخیر ایک ایسے انعام کا اجرا کرنا چاہیئے جو بچوں کے لئے بہترین تصنیف کردہ کتاب پر دیا جائے۔ نقد انعام کے علاوہ تمغے، سندات اور اعتراف قابلیت کے دیگر ذرائع بھی اختیار کئے جا سکتے ہیں۔

بہر حال بنیادی بات یہ ہے کہ بچوں کی کتابیں لکھوانے کے لئے حقیقی ترغیب و تحریک ہونی چاہیئے۔ ایسی کتابیں جو دیکھنے میں خوب صورت اور دیدہ زیب ہوں، خریدنے میں ارزاں ہوں ——— ایسی کتابیں جو مستقبل کے شہریوں کے کردار کی تشکیل کریں ——— ایسے شہری جو کسی کے خلاف نفرت و تعصب کو اپنے دل میں جگہ نہ دیں۔ اور جن کے نزدیک پاکستان کی خدمت ایک وسیلہ ہو، انسانیت کی خدمت کا۔ ایک مسلمان کے لئے تمام بنی نوع انسان ایک غیر منقسم کل ہیں یہ "ہم لوگوں اور ان لوگوں" کی قسم کی اکائیوں میں

itsurdu.blogspot.com

منقسم نہ ہوں۔ جیسے کہ یورپ کی قوم پرستی ہمیں سکھاتی ہے۔ یہ ایک نیا خیال معلوم ہوتا ہے لیکن چونکہ پاکستان ایک نیا ملک ہے اور دنیا یہ توقع کرتی ہے کہ ہم دنیا کی خوشحالی اور بہبود کے لئے پرانے ملکوں کی نسبت بڑھ چڑھ کر کام کریں۔ امید رکھنی چاہیئے کہ ہم دنیا کی توقع پوری کریں گے انشاءاللہ ؂

بچوں کا ادب اور نفسیات

ڈاکٹر سلیم اختر

بچوں کا ادب، ادب کا نہیں بلکہ نفسیات کا مسئلہ ہے۔ "ادب" کا نام لیتے ہی ہمارے ذہن میں ادب، اس کی تخلیق اور مقاصد سے وابستہ تمام تنقیدی اور فلسفیانہ نظریات اور دیگر نزاعی مباحث آجاتے ہیں۔ "بڑوں" کی زندگی، شخصیت اور مسائل وغیرہ میں جو پیچیدگی پائی جاتی ہے۔ ادب جب اس کی عکاسی سے پہلوتہی کرے یا ناکام رہے تو اگر وہ بے معنی نہ بھی سمجھا جائے تو کم از کم صحت مندی سے ضرور ہی عاری جانا جائے گا۔ ادیب تخلیق کے وقت موضوع کی وضاحت اور مواد کی پیش کش کے لئے تکنیک کے نت نئے تجربات اور اسلوب کی دلآویزیوں سے کام لیتا ہے۔ ادھر قاری انفرادی زندگی اور اجتماعی مسائل کے پس منظر میں ادب پارے مطالعہ سے اس کے حسن و قبح کا فیصلہ کرتا ہے۔ پھر ہر قاری کی اپنی اپنی مخصوص نفسیاتی ساخت ہوتی ہے جو کسی مخصوص صنفِ ادب کے لئے ترجیح اور پسندیدگی کی شدت کا تعین کرتی ہے۔ الغرض "بڑوں" کے لئے ادب کی تخلیق، مطالعہ اور تنقید ایک پیچیدہ عمل کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

بالغوں کے مقابلے میں گو جہانِ طفلی بڑا پُرسکون بے پروا اور آرام و آسائش سے پُر نظر آتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ بچے مسائل سے ناآشنا ہوتے ہیں ان کے بھی مسائل اور ذہنی الجھنیں ہوتی ہیں۔ صرف ردِ عمل کے انداز اور نوعیت میں فرق ہوتا ہے۔ اس ضمن میں بچہ کی نفسیاتی ساخت بہت اہم کردار ادا کرتی ہے اور مسائل کی شدت کے احساس میں کمی بیشی اور عام زندگی میں ان کے بارے میں ردِ عمل کا انحصار اسی پر ہوتا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو ضدی، چور، بدتمیز وغیرہ "نوراتی" بچوں کی تعداد اتنی نظر نہ آتی۔

ہم نے بچوں کے بارے میں بعض شاعرانہ باتوں کو آنکھیں بند کر کے تسلیم کر لیا ہے

itsurdu.blogspot.com

مثلاً "بچپن" سنہری زمانہ" ہے۔ اگر سنہری زمانہ سے صرف روزی کے چکر سے لاتعلقی مراد ہے تو یہ جزوی طور سے درست ہونے کے باوجود کوئی ایسی اہم بات نہیں، دراصل پریشانیوں کے بھنور میں گھرے ہوئے بڑے بچوں کی آزادی کو ترستی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہیں جبکہ حقیقت میں بچہ بڑوں کو آزاد، خوش اور بے پروا محسوس کرتے ہوئے خود کو پابندیوں میں جکڑا ہوا پاتا ہے۔ وہ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے غرضیکہ ہر معاملے میں

"ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی"

کہتا نظر آتا ہے۔ بلکہ اگر ژرف نگاہی سے دیکھا جائے تو پابندی اور "تہمت ہے مختاری کی" کا احساس بڑھتی عمر کے ساتھ بڑھتا ہی جاتا ہے ـــــ بچوں میں پژمردگی (FRUSTRATION) کی دیگر وجوہات میں بچگانہ حسد، گھر کا ناخوشگوار ماحول امتناعات (INHIBITONS) اور والدین ہیں۔

اس نفسیاتی پس منظر میں اگر بچوں اور ان کے لئے تخلیق کئے جانے والے ادب کا تجزیہ کیا جائے تو یہ مسئلہ اور بھی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ بچوں کے ادب پر میری نظر سے جتنے بھی مضامین گزرے (مثال: ممتاز حسن میرزا، ادیب، مجتبیٰ حسین ـــــــــ ان سبھی میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ بچوں کا ادب کیسا ہو؟ میرے خیال میں یہ اساسی مسئلہ نہیں بلکہ پہلے تو اس کا تعین کرنا چاہیئے کہ وہ بچوں کے کن رجحانات کی تسکین سے نفسی (PSYCHIC) آسودگی بہم پہنچاتا ہے۔ "کیسا ہو؟" فلسفیانہ انداز ہے جبکہ "کیا ہے؟" نفسیاتی مطالعہ کے حدود میں آجاتا ہے اور اسی لئے تو مضمون کے آغاز میں یہ لکھا گیا ہے "بچوں کا ادب۔ ادب کا نہیں بلکہ نفسیات کا مسئلہ ہے۔"

اس ضمن میں سب سے پہلے بچہ کی نفسیاتی ساخت کا مطالعہ ضروری ہو جاتا ہے بچہ اس کی نفسی نشوونما اور کرداری محرکات کے تجزیہ اور مطالعہ کے لئے پیش کردہ نظریات میں سے فرائڈ کا طفلی جنسیت کا نظریہ اور ایڈلر کا عضویاتی کہتری کا نظریہ بہت مشہور ہیں۔ ان کے برعکس ولیم جیمز کی مانند بہت سے ماہرین کے خیال میں بچہ کا ذہن صاف سلیٹ کی مانند ہے۔ ہمارے لئے کسی ایک مخصوص نظریہ ہی کی روشنی میں آگے بڑھنے

سے بھٹکنے کا ڈر ہے۔ کیونکہ کسی خاص نظریہ اور اس کے پیش کردہ ذہنی تعصبات سے ہٹ کر دیکھنے پر بچوں کی بعض ایسی نفسی خصوصیات ہیں جو "انبارمل" اور استثنائی مثالوں سے قطع نظر تمام بچوں میں پائی جاتی ہیں۔

اس سلسلے میں تخیل جسے طفلانہ خود فریبی (MAKE BELIEVE) اور بھی زیادہ زرخیز بنا دیتی ہے۔ نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ یہی زیادہ فراوانی کی صورت میں "فینٹسی" کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس کی اساس عموماً خواب بیداری پر استوار ہوتی ہے۔ اس کے بعد خوف سے نفسی دلچسپی ہے۔ بلکہ سی جی ژنگ کے اجتماعی لاشعور کی روشنی میں تو خوف بے حد اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ ہیولاک ایلس نے طفلانہ جنسیت کے ضمن میں "دردپسندی" (ALGOLAGNIA) کو اہم کرداری رجحان قرار دیتے ہوئے آزادپسندی (SADISM) اور اذیت پرستی (MASOCHISM) کی صورت میں ظاہر ہونے والی کجروی کی مثالوں کی اساس قرار دیا ہے۔ والدین سے بالخصوص اور افراد خاندان سے بالعموم بچوں کا جو گہرا جذباتی اور ذہنی رابطہ ہوتا ہے۔ اس کے اثرات صرف وقتی اور سطحی ہی نہیں ہوتے بلکہ بقول فرائیڈ وہ فرد کی جنسی اور جذباتی ساخت کے انداز کے تعین کا باعث بھی بنتے ہیں۔

ان کے علاوہ دیگر کرداری خصوصیات بھی ہیں۔ لیکن یہ چار اسی بنا پر نمایاں اور اہم ہیں کہ بیشتر کرداری خصوصیات ان میں سے کسی ایک کی ذیل میں لائی جا سکتی ہیں۔

آیئے! اب تفصیل مطالعہ سے یہ دیکھیں کہ بچوں کا ادب کسی حد تک ان کی تکمیل کا باعث بنتا ہے۔

بچہ خاصی عمر گزار لینے کے بعد خود کو افراد خاندان اور بعد ازاں خارجی ماحول کے مختلف النوع بلکہ بسا اوقات تو متضاد تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں کر سکتا۔ امر و نہی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا بچہ اور اس کی نمو پذیر EGO اپنے اظہار کے لئے کھلونوں۔ باشراتوں یا بدتمیزیوں کی صورت میں جن جن وسائل کو بھی بروئے کار لاتے۔ بالعموم ماحول ان سے متصادم نظر آتا ہے۔ پابندیوں اور ان کی پیدا کردہ مجبوریوں کا یہ احساس اور

itsurdu.blogspot.com

شدید صورتوں میں اس کی پیدا کردہ گھٹن اور پژمردگی کی بنا پر بچہ عالم آزادگاں کی مانند "اک جہاں سب سے الگ" بسا کر وہاں "اک محشر خیال" بپا رکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہاں طفلانہ تخیل کو بالغ، یا فن کارانہ تخیل سے خلط ملط کرنے کی ضرورت نہیں۔ بالغانہ تخیل پروار ہونے کے باوجود بے پر کی نہیں اڑ سکتا۔ کیونکہ یہ تخیل عام مشاہدات و تجربات پر مبنی عقل عامہ کا پابند ہوتا ہے۔

اسی طرح گو آزاد اڑانوں اور (MAKE BELIVE) میں فنکارانہ تخیل بھی طفلانہ تخیل سے مشابہت رکھتا ہے۔ لیکن یہاں فنکار کا تنقیدی شعور، جمالیاتی حس اور ذوق و وجدان اسے بے راہ روی اور گمراہی سے بچائے رکھتے ہیں۔ لیکن بچہ ان سب پابندیوں سے آزاد ہونے کی بنا پر اپنے تخیل میں بن کی ہوا جیسی آزادی کا حامل ہوتا ہے۔ اس تخیل میں اشیاء اور افراد کو اپنے مخصوص حالات اور افتاد طبع کی پیدا کردہ پسند و ناپسند کی عینک سے دیکھنے اور پھر انہیں وہی کچھ سمجھنے سے رنگ آمیزی پیدا ہوتی ہے اور اسی کو طفلانہ خود فریبی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس بالغ ذاتی نفع نقصان اور پسند ناپسند سے بالاتر ہو کر اشیاء اور افراد کو ان کے اصل روپ و رنگ میں دیکھتے ہیں۔ اسی لئے انہیں بالغ کہا جاتا اور بالغ نظر سمجھا جاتا ہے جبکہ ایسا نہ کر سکنے والوں کی تعصب اور نیوراتیت کے درمیان کئی اقسام مل جاتی ہیں۔ جبکہ بچہ نیوراتی نہ ہونے کے باوجود نیوراتیت کے بہت سے خصائص کا حامل ہوتا ہے۔

بچہ چونکہ ادبی اور تنقیدی مباحث سے بھی ناآشنا ہوتا ہے اس لئے وہ بڑے سکون اور دلچسپی سے کہانی کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ اس کے لئے اچھی کہانی ادب برائے زندگی والی نہیں بلکہ دلچسپ کہانی ہی اچھی کہانی ہوتی ہے۔ محدود قابلیت کی بنا پر وہ بسا اوقات اسلوب کے حسن و قبح سے بھی بے نیاز ملتا ہے اس کے لئے تو واقعات کا تذبذب (SUSPENSE) اور اس کی پیدا کردہ دلچسپی ہی ادب ہے۔

پسند کا یہ معیار کچھ اتنا بچکانہ بھی نہیں بلکہ باقاعدہ تعلیم یافتہ اور عاقل بالغ اصحاب میں بھی ادب اور دلچسپی کو ہم معنی سمجھنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ جاسوسی، مہماتی اور تاریخی

ناولوں کا یہی جواز ہے۔ ثقہ نقاد انہیں بدذوق قرار دیکر انہیں ادبی قاری نہ مانیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار بھی نہیں برتا جا سکتا۔

کہانی میں دلچسپی بچہ کے لئے ایک اہم ذہنی مطالبہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ادب سے اس کی تعلق کا ذکر ہی چھوڑیئے۔ لیکن یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ بچوں نے کہانیوں کے مقابلہ میں خشک نصابی مضامین میں کبھی بھی دلچسپی نہیں لی اور عام قیاس کے برعکس اس کی وجہ نالائقی یا تعلیم سے عدم دلچسپی نہیں بلکہ ان مضامین میں ایسی کوئی خصوصیت نہیں جس کی بنا پر مناظر بچہ کے تخیل میں زندہ اور متحرک ہو سکیں۔ بچہ کے لئے واقعات کی دلچسپی مقصود بالذات نہیں بلکہ الفاظ ذہن کے دریچے وا کر کے چشم تخیل کے لئے سرمے کا کام کرتے ہوئے ان دیکھے جہان کی سیر کا باعث بنتے ہیں اور بعض نفسی تقاضوں کی شعوری یا لاشعوری آسودگی کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ اسے اصطلاح میں (EIDETIC IMAGERY) کہا جا سکتا ہے[1] اور اسی لئے تو مہماتی مافوق الفطرت اور خارق عادات واقعات سے بھرپور کہانیاں صرف بچوں ہی کے لئے نہیں بلکہ بے شمار بالغ بچوں کے لئے بھی دلکشی کی حامل ثابت ہوتی ہیں جاسوسی اور سائنسی داستانوں (SCIENCEFICTION) کی مقبولیت بھی بنا پر ہے۔

یہ بجا ہے کہ ایسا ادب خام تخیل ہی کے لئے مرغوب ہو سکتا ہے کیونکہ تخیل پر عقل و استدلال کی گرفت کی سختی اور ادب (یا فنون لطیفہ) سے بعض مقاصد کی بجا آوری کی توقع میں شدت کے ساتھ ساتھ ایسا ادب محض "فرار" "گریز" "توضیع اوقات" اور "بچکانہ" نظر آنے لگے گا۔ بڑوں کے لئے جو بدمذاقی ہے، بچہ کے لئے وہی سب کچھ ہوتا ہے خوش قسمتی سے وہ تنقیدی مباحث سے ناآشنا ہے۔ اس لئے ادب سے اس کی آسودگی

---

[1] ایجری کی اس قسم میں فروچشم تصور میں کسی خاص واقعہ کی دوبارہ تشکیل کر سکتا ہے اور یہ نقل مطابق اصل ہوتی ہے۔ بچوں میں بالعموم یہ ایجری ملتی ہے۔

A PSYCHOLOGICAL APPROACH TO LITERARY CRITICISM". P. 61

itsurdu.blogspot.com

خالص ہوتی ہے۔

بچوں کے ادب کے تقریباً سبھی نقادوں نے دنیش کے طور پر ہی سہی، ان کہانیوں کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے جن پر (تعارف کی خاطر) جنوں، بھوتوں کی کہانیوں کا لیبل چسپاں کیا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ موجودہ زمانہ شہزادوں، شہزادیوں، جادوگروں اور طلسمی جانوروں کا نہیں اور نہ اب ہمیں ایسے ہوش ربا طلسمات سے سابقہ ہی پڑ سکتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت کیوں فراموش کر دی جاتی ہے کہ جادو اور بھوت پریت جدید تخیل کی نہیں بلکہ انسانی تہذیب کے ان ابتدائی مراحل کی یادگار ہیں۔ جب انسان نے فطرت کی پراسرار قوتوں سے خوفزدہ ہو کر اپنے پراسرار ذہنی واہموں کی تجسیم اور بعد ازاں ان کی پرستش سے اپنے خوف سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش ہی نہ کی تھی۔ بلکہ ان میں سے بعض مظاہر کو الوہی صفات سے آراستہ کر کے انہیں اپنے لئے باعث نجات بھی قرار دے کر بعد کے عظیم مذاہب اور روحانیت کے لئے خشت اول کا کام لیا۔

آج کے انسان کا پیچیدہ ذہن یوں ہی نہیں بن گیا۔ بلکہ اس پیچیدگی کی تشکیل میں ہزاروں سالہ تہذیبی اور تمدنی عوامل شامل ہیں اگر آج انسانی ذہن بالغ ہے تو تہذیب کے ابتدائی دور سے تعلق رکھنے والے انسان کا ذہن بچے کے ذہن جیسا تھا۔ ژنگ کے اجتماعی لاشعور (COLLECTIVE UNONSCIOUSNESS) کی تو اساس ہی اس پر ہے کہ ہمارے قدیم آباؤ اور عہد عتیق کے اجداد کے نفسی رجحانات اور خلقی میلانات ان کے ساتھ ہی نہیں مٹ گئے بلکہ لاشعور کے ایک اہم حصے کی صورت میں ہمارے بعض محرکات کی بنا بنتے ہوئے اب تک موجود ہیں۔ "جنگل" "خوف" "عورت" اور بعض درختوں اور جانوروں کو (ARCHETYPAL) صورت دے کر شاعری اور ذہن کو متاثر کرتے ہیں۔

لیکن اتنی گہرائی میں جائے بغیر بھی یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ جس طرح ابتدائی انسان کو جادو، مافوق الفطرت اور عادت سے دلچسپی تھی۔ اسی طرح بچہ اگر ذہنی ارتقا کے لئے ادب کا سہارا لے تو اس کے لئے طلسماتی داستانوں سے دلچسپی ایک لحاظ سے لازمی اور

منطقی ہو جاتی ہے۔

ژنگ کے خیال میں اندھیرے سے بچہ کا خوف ان اجتماعی لاشعوری محرکات کی بنا پر ہے جن کا سلسلہ ان آباؤ اجداد سے شروع ہوتا ہے جو تاریک غاروں میں خوفزدہ رہتے تھے۔ اسی طرح "جنوں بھوتوں" کی داستانوں سے دلچسپی کی صورت میں بھی گویا ان قدیم محرکات کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا جاتا ہے۔

اس نفسیاتی بحث سے قطع نظر سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ بچوں کے ادب پر نہ تو بالغوں کی تنقیدی پابندیاں ہونی چاہئیں اور نہ ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔

اس سے پہلے بچہ کے تخیل اور تخیل کی زرخیزی کا تذکرہ ہو چکا ہے یہ داستانیں اس کے تخیل کے لئے "خام مواد" کا کام کرتی ہیں۔ کیونکہ بچہ مطالعہ کے بعد خواب بیداری اور "فینٹسی" کی صورت میں خود کو اس طلسماتی فضا میں محسوس کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ خصوصیت سے تنہائی پسند، حساس یا احساس کمتری کے بارے میں بچوں کے لئے تو ایسی داستانیں اچھے نامے مرہم اور بام کا کام کرتی ہیں۔ چند گھڑیوں کے لئے وہ خود کو اپنی محدود دنیا کے "مسائل" اور ان کی "تلخیوں" سے دور انجانی اور طلسماتی فضا میں محسوس کرتے ہوئے اپنے "غموں" اور "دکھوں" کا بوجھ ہلکا کر لیتا ہے۔ یہ فرار ہے، چلئے فرار ہی سہی۔ لیکن واقع رہے کہ بچہ کی ناقراں شخصیت اور کمزور انا ابھی تک حقائق سے آنکھیں چار کرنا تو سیکھی ہیں اور نہ اس میں اتنی سکت ہی ہوتی ہے اس لئے بالغوں کے برعکس یہ فرار بالعموم بچہ کے لئے نفسیاتی مضرت رساں کا باعث نہیں بنتا۔ ہاں کمزوری اور نیوراتی رجحانات کی صورت میں یہ بعض اوقات نقصان دہ ثابت ہو تو ہو اور تب بھی ادب کا اتنا قصور نہ ہوگا۔ کیوں کہ نیوراتیت بیشتر بے ضرر اشیاء کو بھی اپنے لئے نقصان دہ بنا سکتی ہے۔

بنگلہ اکیڈمی نے قومی مرکز کتب پاکستان کے تعاون سے مشرقی پاکستان میں بچوں کے ادب کا ایک جائزہ مرتب کیا ہے جو ۴۲-۱۹۴۸ء کے زمانہ کو محیط ہے۔ یہ جائزہ یونیسکو نے شائع کیا ہے۔ اس دوران میں کل ۷۳۲ کتابیں شائع ہوئیں جن میں سے ۱۷۱ کتابوں میں مافوق الفطرت مہماتی اور جاسوسی کہانیاں ہیں۔ جائزہ میں عام ادب کو تین حصوں میں تقسیم

itsurdu.blogspot.com

کیا گیا ہے ان میں ۱۵۰ افسانوی ادب کی کتابیں ہیں ان کے علاوہ ان کتابوں میں ۴۹ جنوں بھوتوں کی کہانیاں، ۴۳۰ ناول اور ۲۳ ڈرامے ہیں۔ ان اعداد سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ایک خاص عمر کے بچوں کے لئے ایسی کہانیوں کی کشش کبھی کم نہیں ہو سکتی۔

بچے ترنجے "بڑے" بھی خوف اور دہشت انگیز واقعات و مناظر پر مبنی داستانوں کو لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں عورتیں اور کمزور اعصاب والے مرد پیش پیش نظر آتے ہیں۔ بالغوں میں دہشت انگیزی سے انسانی ہیجانات کے ایک مخصوص ردِ عمل کے لئے ارسطو نے (المیے کے ضمن میں) تزکیہ (KATHARSIS) کی (تمنا زعرفیہ) اصطلاح استعمال کی تھی جو بالغوں کے لئے مفید ہو تو ہو مگر بچوں کے لئے ایسے، یا اسی قبیل کے دیگر نظریات سے رجوع کرنا چنداں سود مند ثابت نہیں ہو گا۔

تخیل کی بنا پر خوف زدہ کرنے والے واقعات سے اعصاب پر تناؤ پیدا ہو جاتا ہے جو "تذبذب" سے اور بھی شدت اختیار کر جاتا ہے تا آنکہ نقطۂ عروج تک حالت تار کے تار جیسی ہو جاتی ہے جب خوشگوار انجام سے اعصاب ایک دم سکون پذیر ہوتے ہیں تو ذہن بلکہ رگ و پے میں ایک خاص قسم کی بالیدگی اور سکون کا احساس ہوتا ہے۔ بچوں کے ساتھ ساتھ اس عمل کا مظاہرہ بالغوں میں بھی کسی حد تک کیا جا سکتا ہے۔

جاسوسی اور مہماتی ناولوں کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز مستقل تذبذب سے اعصابی تناؤ، نقطۂ عروج پر دل کی دھڑکنوں میں اضافہ اور پھر اختتام سے اعصاب میں سکون کی لہروں سے بالیدگی کے احساس میں مضمر ہے۔ اسی لئے تو برام سٹوکر کا "ڈریکولا" آج بھی مقبول ہے۔

خوف کے سلسلے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ باغ اور بچہ کے لئے خوف کے نتیجے میں خاصا فرق ہوتا ہے۔ مثلاً "ڈریکولا" پڑھتے وقت ہر شخص ڈر سکتا ہے جبکہ کالے دیو کے قبضہ میں کسی شہزادی کو دیکھ کر صرف بچہ ہی ڈر سکتا ہے۔ ہم دیو کا وجود نہیں تسلیم کرتے اس لئے دیو کا لفظ ہمارے ذہن میں تلازمات خیال کے لئے باعث تحریک نہیں بنتا۔ جب کہ بچہ (جس کے لئے شام کی ہر پرچھائی ایک پر اسرار دیو ہے) الفاظ کے ذریعے سے

اپنے ذہن میں کالے دیو کو مجسم دیکھ سکتا ہے۔ عام عقیدے کے برعکس خوفزدہ کرنے والی کہانیاں کوئی خاص نقصان نہیں پہنچاتیں۔ بلکہ رنج سے محزون ہونے کی مانند ڈر سے محزون ہو کر بھی کسی حد تک ختم کیا جا سکتا ہے، بلکہ امریکہ میں تو بعض ماہرین نفسیات کے مشوروں کی روشنی میں خوفناک صورتوں والے کھلونوں بنائے جاتے ہیں۔ تاکہ کھیل ہی کھیل میں بچہ کا ڈر ختم ہو جائے۔ اسی طرح ایسی داستانوں سے ڈرنے والا بچہ بڑا ہونے پر اپنے طفلانہ خوف پر ہنس بھی سکتا ہے۔ اور یہ ہنسنا ہی اسے بالغ زندگی میں آنے والے بہت سے "جنوں بھوتوں" سے خوفزدہ ہونے سے بچا سکتا ہے۔

گو عام طور سے اس پر غور نہیں کیا جاتا۔ لیکن بچوں میں (ایک خاص عمر تک) درد سے بہت شدید قسم کی دلچسپی ملتی ہے اکثر بچے (معصومانہ طور سے ہی سہی) جسمانی درد (یا اذیت) میں مبتلا ہو کر یا دوسروں کو مبتلا دیکھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہیولاک ایلس نے اس وقوعہ پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اس کے بقول:

"بچے دوسروں کو درد میں مبتلا کرنے، انہیں دیکھنے یا خود درد محسوس کرنے سے پُر مسرت دلچسپی رکھتے ہیں۔ بالعموم ان وقوعات کو ظلم، آزار پسندی، اذیت پرستی جیسے بالغوں کے دیئے ہوئے نام دیئے جاتے ہیں۔ اور ایسا اغلب بھی ہے۔ کیونکہ بڑے طفلانہ نفسی مظاہر کی تشریح اپنے طور سے ہی تو کر سکتے ہیں لیکن یہ نام اس بنا پر گمراہ کن اور افسوسناک ہیں کہ یہ طفلانہ مطمح نظر سے کوسوں دور ہیں مثلاً:

بچہ تو ابھی تک انسانیت پر مبنی ظلم کے تصور سے ہی بے گانہ ہے اور پھر جب اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ذہن نشین کر لی جائے کہ بہت سے بالغوں کے لئے بھی اس کا تصور واضح صورت نہیں رکھتا تو اس صورت میں ہمیں اس بچہ پر متعجب نہ ہونا چاہیئے جو بڑے مزے سے جانوروں کی تکلیفیں دیکھنے میں مگن ہی نہیں رہتا بلکہ موقع ملنے پر ان کی تکلیف میں اضافہ سے بھی گریز نہیں کرتا ..... درد اور اذیت پر مبنی خواب بیداری تو خاصی بڑی

itsurdu.blogspot.com

عمر کے بچوں میں بھی مل جاتے ہیں بلکہ ذرا بڑی عمر کے بچوں کے لئے تو ناکس کی کتاب (BOOK OF MARTYRS) بھی پر کیف لذت کا باعث بنتی سنی گئی ہے۔" (جنسی نفسیات صد ۸۲-۸۳)

ہیولاک ایلس نے ناکس کی جس کتاب کا حوالہ دیا ہے وہ ان مذہبی شخصیات کے سوانح پر مشتمل ہے جنہوں نے عیسائیت کی خاطر اذیت ناک مظالم کے باعث جان دی۔ گو یہ کتاب اس مقصد کے لئے نہیں لکھی گئی تھی کہ بچے اسے اپنی درد پسندی کی تسکین کا وسیلہ بنائیں۔ لیکن بچوں نے اس سے یہ کام بھی لے لیا۔ عزیز اثری کی کتاب "عالی پر کیا گزری" کی مقبولیت میں ایسے مناظر کا بھی ہاتھ ہے۔

بچے کہانیوں میں درد، اذیت اور دہشت کے واقعات سے اپنے جارحانہ رجحانات کی شعوری یا لاشعوری تسکین کر لیتے ہیں۔ اس کے برعکس حالت کا مشاہدہ ان بچوں کی صورت میں کیا جا سکتا ہے، جن میں رحم، ہمدردی اور ترس کوٹ کوٹ کر بھرا جاتا ہے اور یہ اذیت پر مبنی واقعات سے اپنے رحم اور ترس کی بنا پر ہی لطف اندوزی حاصل کر لیتے ہیں۔

بچہ کی نفسی نشوونما کا انداز متعین کرنے میں ماحول اور افراد خاندان کے علاوہ والدین اہم ترین کردار ادا کرتے ہیں۔ بچہ، اس کی انا اور شعور نشوونما کے لئے مضبوط سہاروں کی محتاج کوئل بیل جیسے ہوتے ہیں۔ والدین میں سے کسی ایک کی ذات سے گہری ذہنی وابستگی دراصل انائی معیار کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ یہ بطل پرستی (HERO WORSHIP) کی ابتدائی اور خام سی صورت ہوتی ہے۔ اور یہ ذہنی وابستگی ہی بعد ازاں بالغ طرز عمل کی صورت میں افراد اور شخصیات کی پسند و ناپسند کے معیار کی اساس بنتی ہے۔ بچہ بعض اوقات افراد خاندان یا والدین میں سے کسی ایک یا دونوں ہی کو ناپسند کرتا ہے۔ ایسا بالعموم جابر یا ترجیحی سلوک کرنے والے والدین کی صورت میں ہوتا ہے۔ سوتیلا پن بھی ایک عمومی باعث ہو سکتا ہے۔

غرضیکہ پسند و ناپسند کی مختلف النوع وجوہات کی بھرمار کے نفسیاتی ردعمل سے اس کی شدت کے مختلف درجات ہو سکتے ہیں۔ یہ پسند و ناپسند کہانیوں سے بھی تسکین پاتی ہے۔ طفلانہ تخیل کی اسی اہم خصوصیت طفلانہ خود فریبی کے باعث حقیقی زندگی کی سوتیلی ماں کہانی میں بچوں کو

کھا جانے والی ڈائن بن جاتی ہے۔ ہر وقت غضب ناک اور غضبناک رہنے والا باپ، خوفناک جادوگر، روپ دھار لیتا ہے اور ہر وقت تنگ کرنے والے بھائی بہن خونخوار درندوں اور عیار جانوروں کی صورت میں رونما ہوتے ہیں۔ برعکس صورت میں بھٹکتے ہوئے شہزادے پر ترس کھانے والی نیک دل بڑھیا ماں ہے اور خیاتوں کے پتلے سینگوں والے دیو کو ختم کرنے کے لئے شہزادہ کی امداد کرنے والا رحم دل جادوگر باپ ہے اور یہ کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ شہزادہ خود رحمدل ہے جبکہ لڑکی کی صورت میں مظلوم شہزادی یا خوبصورت گڑیا اداس پری۔

یہ عمل شعوری بھی ہو سکتا ہے اور لاشعوری بھی۔ مگر ہر دو صورتوں میں بعض نفسی الجھنوں اور نفرت یا معاندانہ احساسات کی لاشعوری تسکین سے ان کی تطہیر کا باعث بنتے ہوئے ارتقا پذیر شخصیت کی نشوونما میں مدد ہی ثابت ہوتا ہے۔ زیادہ شدید یا واضح صورت میں یہ تطبیق (IDENTIFICATION) بن جاتا ہے اور یوں ننھا قاری ——— شعوری یا لاشعوری طور سے جب کسی ایک کردار سے خود کو ہم آہنگ کر لیتا ہے تو کرداروں کی خوشی غم، دکھ، پریشانی اور جسمانی اذیت سب کچھ اس کی ذات کا ایک حصہ بن جاتے ہیں اور دوران مطالعہ یہ سب کچھ محسوس ہی نہیں کیا جاتا بلکہ بعض اوقات ذہن پر ان کے نقوش ان مٹ بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ ایسے حضرات کی کمی نہیں جو بلوغ کے بعد بھی بچپن کی کہانی کے شدید اثرات کو جب چاہیں ذہن میں دوبارہ لا سکتے ہیں۔ بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ بچپن میں فلاں کتاب نے میری زندگی بدل کر رکھ دی، تو یہ دراصل تطبیق ہی کی بنا پر ہوتا ہے۔

ابلاغ کی کامیابی کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ قاری (بعض نفسی تقاضوں کی بنا پر ہی سہی) خود کو کردار سمجھ بیٹھے۔ تطبیق صرف بچوں ہی کے لئے مخصوص نہیں بلکہ ہر عمر اور ہر نوع کی تہذیب و تمدن کا قاری بھی خود کو بعض کرداروں سے ہم آہنگ کر لیتا ہے کسی زمانہ میں امریکی جوانوں میں ارنسٹ ہیمنگوے کے کرداروں کے رنگ میں باتیں کرنے کا فیشن سا ہو گیا تھا۔ اسی طرح رومانی اور المیہ افسانوں یا ناولوں کے دوران مطالعہ کتنی ہی جذباتی لڑکیوں کے تکیے آنسوؤں سے بھیگ بھیگ جاتے ہیں۔

اس تمام مضمون میں ایک خاص قسم کی کہانیوں ہی سے بحث کی گئی ہے اس کی وجہ

itsurdu.blogspot.com

یہ ہے کہ بچوں کا خالص ادب دراصل ایسی کہانیوں سے ہی عبارت ہے بچہ جب تک کہ بچہ ہے (استثنائی مثالوں سے قطع نظر) ایسی ہی کہانیاں پسند کرے گا۔ جس دن اس کی پسند میں تبدیلی آگئی تو وہ بچہ نہ رہے گا بلکہ ذہنی بلوغ کی طرف ایک قدم بڑھ چکا ہوگا۔ گو بچہ کا تصور عمر سے ہی ہوتا ہے لیکن عمر کے ساتھ ساتھ ذہنی استعداد اور "آئی۔ کیو" کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور یوں ذہنی لحاظ سے ڈاڑھی مونچھ والا بھی بچہ ہو سکتا ہے۔ اور اسی طرح کسی بچہ کے کندھوں پر بوڑھے کا سر بھی مل سکتا ہے۔

بچوں کے ادب کا ذکر منظومات کے بغیر نامکمل رہ جاتا ہے۔ بیشتر بچوں میں آہنگ اور لے کا شعور فطری ہوتا ہے۔ بچہ کا موسیقی (اور شعری ادب) سے پہلا تعارف لوری کی صورت میں ہوتا ہے۔ ایک خاص انداز سے تھپکے جانے سے اعصاب آہنگ اور وزن سے روشناس ہوتے ہیں اور لوری کی دھیمی دھیمی لے اور آواز کا زیر و بم یہ سب مل کر اس کے لاشعور میں احساس آہنگ کو مرتسم کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ اسی لئے تو بعد ازاں چیخ چیخ کر نظمیں پڑھ کر یا اپنی دانست میں گا کر وہ خوشی محسوس کرتا ہے۔ بچوں کے شعری ادب میں NURSERY RHYMES بہت نمایاں حیثیت کی حامل ہیں ان میں خیالات اور اسلوب کی کوئی اہمیت نہیں۔ صرف الفاظ کی صوتی تکرار اور آہنگ سے ہی جادو جگایا جاتا ہے۔ کم سن بچہ نظم کی مقصدیت یا اسلوب کی دلآویزی کی قدر نہیں کر سکتا وہ چند رواں اور متحرک الفاظ کو کسی مترنم بحر کے دھاگے میں پرویا ہوا دیکھنا چاہتا ہے اور ان کے آہنگ میں اس کا لطف مضمر ہے۔ "ٹوٹ بٹوٹ" کی کامیابی کا یہی راز ہے۔

اس کے بعد ہلکے پھلکے الفاظ اور سہل انداز سے بچے کو اس کے ماحول اور مناظر فطرت سے متعارف کرانے والی نظمیں ہیں، اس ضمن میں اسماعیل میرٹھی کی نظمیں کلاسیک کا درجہ اختیار کر چکی ہیں۔

علاوہ ازیں بچوں کے رسائل میں خود بچوں ہی کی تحریر کردہ نظمیں بھی یہی فریضہ ادا کرتی ہیں۔ انہیں لکھنے والے چونکہ پیشہ ور ادیب نہیں، اسی لئے انہیں جھوٹ موٹ کا بچہ بن کر لکھنے کے لئے اپنے مخصوص اسلوب سے ہٹ کر مصنوعی انداز اپنانے کی

ضرورت نہیں ہوتی بلکہ زبان اسلوب، خیالات، حتیٰ کہ ان کی غلطیاں سبھی کچھ بچگانہ ہوتا ہے اور اسی لئے وہ ننھے منے قارئین کی ذہنی ضروریات پورا کر دیتے ہیں اسی لئے تو بڑوں کی لکھی ہوئی بعض تحریریں پڑھ کر وہی محسوس ہوتا ہے جو کسی بڑے کو بچہ بننے کے لئے توتلی زبان میں باتیں کرتے دیکھ کر ہو سکتا ہے۔ ان ننھے منے قلمکاروں کی یہ بدقسمتی ہے کہ نقاد حضرات بچوں کے ادب پر لکھتے وقت بچوں کے رسائل میں لکھنے والے بچوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور اگر کسی بڑے نے جھولے سے ایک آدھ کہانی یا نظم گھسیٹ ماری تو اسے "بچوں کے ادیب" کا تمغہ سونپ دیا جاتا ہے۔

بچوں کے رسائل پڑھے بغیر لکھنے والوں کی تو بات ہی چھوڑیئے۔ خود بچوں کے رسالے مرتب کرنے والے بھی لکھتے وقت ان بچوں کو بھول جاتے ہیں جن کی نگارشات سے رسالہ بکتا ہے۔

اس مضمون کے مطالعہ سے غالباً ایک اور بات میری شعوری کاوش کے بغیر ہی خود بخود نمایاں ہوتی گئی ہے وہ یہ کہ ادب سے وابستہ نفسی تسکین کے ضمن میں بچے اور بڑے میں واضح قسم کا امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ نفسیاتی عوامل اور ان سے وابستہ تسکین کے انداز میں کسی حد تک مماثلت ضرور ملتی ہے۔ فرق نوعیت کا نہیں بلکہ صرف شدت کا ہے۔

---

itsurdu.blogspot.com

بچوں کے لئے سیرت کا ادب

محمود الرحمٰن

اردو میں بچوں کا ادب کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اسمیں حضور اکرم صلعم کی سیرت مبارکہ کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے اس نیک کام کا آغاز ادب الاطفال کے بالکل ابتدائی دور میں ہوتا ہے۔ ہمارے صوفیائے کرام نے جب دین کی تبلیغ و اشاعت کے لئے اردو زبان کو وسیلہ بنایا تو اس وقت ان کے پیش نظر بڑی عمر کے لوگ ہی نہ تھے۔ نوعمر افراد کی دینی تربیت بھی ملحوظ تھی چنانچہ دین کی ابتدائی معلومات کے لئے چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے گئے ان میں وہ مضامین بھی شامل ہیں جو حضورؐ کی سیرت پاک پر مشتمل تھے۔

جس طرح اردو زبان و ادب نے سرزمین دکن میں نشو و نما پائی اور ترقی کی منزلیں طے کیں اور اسی طرح بچوں کے ادب کا آغاز بھی وہیں ہوا۔ بزرگان دین نے چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے جو رسالے تصنیف کئے ان کا موضوع اسلام تھا۔ دین کی اہم باتوں اور رسول اکرمؐ کی سیرت پر مشتمل مضامین اسی دور میں مسلسل لکھے گئے اور صحیح معنوں میں انہی سے بچوں کے ادب کا آغاز ہوتا ہے جیسا کہ پروفیسر حامد اللہ افسر رقم طراز ہیں:

"بچوں کے لئے نثر لکھنے کا رواج بھی اردو کے دکنی دور ہی سے ہوتا ہے۔ وہ اردو کا بالکل ابتدائی دور تھا اور ہمارے صوفیائے کرام نے اسلام کے ابتدائی مسائل اور نماز روزہ کی تلقین کے لئے کچھ کتابیں لکھی تھیں جن کا مقصد زیادہ تر یہ تھا کہ ان کی مدد سے بچوں کو مذہبی تعلیم دی جائے۔"

اس ابتدائی دور میں سیرت کے موضوع پر بچوں کے لئے لکھنے والوں نے جو کچھ بھی لکھا اس کا انداز خاصا پرانا تھا۔ ان تحریروں میں ناصحانہ رنگ نمایاں ہے اور ادق الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ انداز بیاں بے حد مشکل ہے۔

مثال کے طور پر ۱۴۹۶ء مصنف شاہ میراں جی کی یہ تحریر ملاحظہ ہو:

"سوائے عزیز! خدا کا صفت بہوت کرتا۔ ہور محمدؐ پر درود بھیجنا، ہور ان کے فرزنداں کوں ہور سب امت کے خاصاں کوں۔"

اس قسم کے اسلوب اور انداز بیان کی نمایاں وجہ یہ ہے کہ اس دور کے ادیب بچوں کے مزاج و مذاق سے بخوبی آشنا نہ تھے۔ بچوں کی نفسیات کا علم تو بہت ہی بعد کی ایجاد ہے اس زمانے میں جو زبان مروج تھی اسی میں وہ سیرت کے موضوع پر کتابیں لکھا کرتے تھے۔

بیسویں صدی کے آغاز کے بعد ہمارے ہاں بچوں کے ادب کو خاص اہمیت حاصل ہوئی۔ لکھنے والوں نے اس صنف کی جانب خصوصی توجہ مبذول کی۔ بچوں کے لئے ایسی کہانیاں نظمیں اور مضامین لکھے گئے جن میں سادگی بھی تھی اور آسان الفاظ کا استعمال بھی۔ لب و لہجہ اور انداز و بیان کو بچوں کے مزاج اور ان کے جذبات و محسوسات کے عین مطابق بنانے کی کوشش کی گئی۔

اس خوش گوار تبدیلی کا براہ راست اثر سیرت کے ادب پر بھی پڑا۔ چنانچہ اس دور میں نہ صرف بچوں کے مزاج و مذاق اور رجحان کے پیش نظر سیرت کی کتابیں لکھی گئیں۔ بلکہ ان میں انداز بیاں، لب و لہجہ اور الفاظ کی سادگی پر خاصا زور دیا گیا۔ حضور اکرمؐ کی سیرت مبارکہ کو بچوں کے لئے نہایت سہل اور آسان طور پر پیش کرنے کی ہر مصنف نے کوشش کی۔

علامہ سید سلیمان ندوی "سیرۃ النبیؐ" کے مصنف کی حیثیت سے خاصے جانے پہچانے ہیں انہوں نے اپنے محترم استاد علامہ شبلی نعمانی کے شروع کئے ہوئے کام کو جس حسن و خوبی سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا وہ ان کے علمی و ادبی مرتبے کو واضح کر دیتا ہے انہوں نے یہ اہم کام لکھ کر نہ صرف اردو میں سیرت کے ادب کو خاصا وقیع بنایا بلکہ خود اردو ادب میں سیرت نگاری کے فن کو جلا بخشی۔

اردو کے اس مایہ ناز ادیب نے چھوٹے چھوٹے کمسن بچوں کے لئے بھی سیرت کی ایسی کتاب لکھی جو نہ صرف برصغیر کے تمام مدرسوں میں داخل نصاب رہی۔ بلکہ ہندی گجراتی اور بنگلہ زبان میں اس کے ترجمے بھی شائع ہوئے۔ سیرت نبویؐ پر بچوں کے لئے لکھی ہوئی اس

itsurdu.blogspot.com

کتاب کا نام "رحمت عالم" ہے۔ اس کے دیباچے میں علامہ سید سلیمان ندوی رقمطراز ہیں :

"ایک زمانے سے دوستوں کا اصرار تھا کہ چھوٹے لڑکوں اور معمولی پڑھے لکھے لوگوں کے لئے سیرت کی ایک ایسی چھوٹی سی کتاب لکھوں جس کا پڑھنا اور سمجھنا سب کے لئے آسان ہو۔"

دوستوں کی فرمائش کی تکمیل میں سید صاحب نے جو کتاب لکھی وہ بچوں کے لئے سیرت کی معرکۃ الآرا کتاب قرار پائی۔ آسان الفاظ میں نہایت سہولت کے ساتھ تمام واقعات کو بیان کر دینا ہی مصنف کا کارنامہ ہے۔ تصنیف کے دوران اس امر کی بھرپور کوشش کی گئی ہے کہ نہ تو کوئی اہم واقعہ چھوٹنے پائے اور نہ ہی واقعات کے بیان میں الجھاؤ پیدا ہو۔ ہر بات اس سادگی اور صفائی کے ساتھ کہی گئی ہے کہ کم عمر قاری کسی ذہنی بوجھ کے بغیر مصنف کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور واقعات کی کڑیاں اس کے شعور میں ایک دوسرے سے پیوست ہوتی چلی جاتی ہیں۔

یہ بات بلاخوف تردید کہی جائے گی کہ سیرۃ النبیؐ جیسی بلند پایہ کتاب کا مصنف جیسا بچوں کے لئے "رحمت عالم" لکھتا ہے تو خود بھی بچہ بن جاتا ہے اور تمام حالات و واقعات کو ایک معصوم بچے کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب نہ صرف دینی اہمیت کی حامل ہے بلکہ بچوں کے ادب کا ایک حسین مرقع ہے۔

آنحضرتؐ کی تعریف و توصیف بیان کرنے کے لئے مصنف نے "رحمت عالم" میں جو طرز نگارش اختیار کی ہے اس کے مطالعہ سے ہی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کتاب بچوں کی ذہنی سطح اور علمی معیار سے کس قدر مطابقت رکھتی ہے۔

"تم روز دیکھتے ہو کہ ہر ایک شخص اپنے دل کی کوئی بات جس کو پیغام کہتے ہیں دور کسی دوسرے کے پاس بھیجتا ہے تو وہ اپنی بات کسی معتبر آدمی سے کہہ دیتا ہے اور وہ آدمی اس بات کو سن کر دوسرے شخص کو سنا آتا ہے۔ اس معتبر آدمی کو ہم قاصد اور پیغام

لے جانے والا اور فارسی میں پیغام بر یا پیغمبر اور عربی میں رسول کہتے ہیں۔"

علامہ سید سلیمان ندوی نے ۱۹۴۰ء میں "رحمت عالم" لکھ کر بچوں کے لئے سیرت کے ادب کا ڈول ڈالا تھا۔ ۳۸ سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی مرحوم کا یہ کام آج بھی بڑی قدر و منزلت کا حامل ہے۔

ہمارے دوسرے بزرگ جنہوں نے بچوں کے لئے سیرت کا ادب تیار کرنے کی جانب اپنی خصوصی توجہ مبذول کی وہ بذات خود بچوں کے بہت بڑے ادیب ہیں۔ میری مراد جامعہ ملیہ دہلی کے قدیم استاد اور "تیمن زندگی" کراچی کے سابق ایڈیٹر عبدالواحد سندھی سے ہے۔ موصوف نے بچوں کے لئے جہاں سینکڑوں کی تعداد میں کہانیاں لکھیں، وہاں انہیں اسلامی تاریخ سے آشنا کرنے کے لئے متعدد کتابیں تصنیف کیں۔

ان کے علاوہ سندھی صاحب کی ایک اہم کتاب جو ہمارے موضوع سے متعلق ہے کا نام ہے "رسول پاک کون تھے"۔ جامعہ ملیہ دہلی کے لئے لکھی گئی اس کتاب کے اب تک ۱۴ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اپنی طرز کی یہ انوکھی کتاب قبول عام کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ پیغمبر کا کونسا ایسا مدرسہ ہوگا جہاں چھوٹے چھوٹے بچوں کو سیرت مبارکہ سے روشناس کرانے کے لئے یہ کتاب نہ پڑھائی گئی ہو۔

عبدالواحد سندھی صاحب نے اس کتاب میں زبان و بیان کی سادگی اور صفائی کے ساتھ ساتھ قصہ گوئی کا انداز پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور جیسا کہ لوگ جانتے ہیں بچوں کو قصہ کہانی سے فطری لگاؤ ہے۔ قصے کے پیرائے میں بیان کی ہوئی ہر بات، چاہے وہ کیسی ہی خشک نہ ہو نوعمر افراد کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لیتی ہے۔ سندھی صاحب نے اس طریقے کو اپنا کر سیرت کے ادب کو بچوں کو خاصا مقبول بنا دیا ہے۔ انہوں نے سرکار دو عالم کی زندگی، آپؐ کے اخلاق، کردار اور حالات و واقعات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ بچہ ذوق و شوق کے ساتھ اس کتاب کا مطالعہ کرتا ہے اور اسے دلی خوشی حاصل ہوتی ہے۔

اب میں مصنف کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں اور وہ بچوں میں خاصا مشہور و معروف ہے اور اس کی تحریریں ننھے منے پڑھنے والوں کی لذت کام و دہن عطا کرتی رہی ہیں۔ یہ

itsurdu.blogspot.com

ہیں۔ الیاس احمد مجتبیٰ اور سیرت مبارکہ پر ان کی لکھی ہوئی کتاب کا نام ہے "پیارے نبیؐ" اس کتاب کی زبان سادہ اور آسان ہونے کے علاوہ بے حد دلچسپ اور پُر لطف ہے سلیس عبارت اور سہل الفاظ پر مشتمل اس کتاب نے بچوں کو حضور اکرمؐ کی سوانح سے جس عمدہ طریقے سے آگاہ کیا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی کے الفاظ ہیں:

"پیارے نبیؐ" آپ کے بچوں، بچیوں، عزیزوں، دوستوں کی کمسن اولاد کے لئے خاندان و وطن کے نونہالوں کے لئے بہترین تحفہ ہے، شیریں زبان، دلآویز طرز بیان، بچے تلے لفظوں میں سچے حالات، نہ اتنے مختصر کہ مطلب خبط ہو جائے، نہ ایسے مفصل کہ طبیعت اکتا جائے۔"

بچوں کے لئے سیرت کے ادب کو مجتبیٰ صاحب کی ذات سے جس قدر فیض پہنچا ہے اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ مجتبیٰ صاحب نے "پیارے نبیؐ" کے علاوہ بے شمار مضامین اور رسالے تصنیف کئے ہیں۔ بچوں کے ادب میں ان سب کی اہمیت مسلم ہے۔ انہوں نے یہ خدمت انجام دے کر سیرت کے ادب کو وقیع بنا دیا ہے۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد:

"تعلیم اور علم مطالعہ کے لئے ضرورت تھی کہ آسان اور صاف زبان میں آنحضرتؐ صلعم صحابہ کرام اور اکابر اسلام کی سیرت پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے جائیں۔ مجتبیٰ صاحب نے جو رسالے لکھے ہیں وہ اس غرض کے لئے نہایت مفید اور موزوں ہیں۔"

علامہ سید سلیمان ندوی، عبدالواحد سندھی اور الیاس احمد مجتبیٰ کے علاوہ ہمارے دوسرے ادیبوں نے بھی اس اہم موضوع کی طرف توجہ کی ہے اور بچوں کے لئے کارآمد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان سب لکھنے والوں کی کوششیں قابل تحسین ہیں ان کی یہ خدمات نہ صرف دینی نقطہ نگاہ سے قدر و منزلت کی حامل ہیں بلکہ ادبی لحاظ سے بھی ان کی وقعت مسلم ہے۔ بچوں کے نثری ادب کو سیرت کی ان کتابوں نے خاصا پروان چڑھایا ہے۔

متذکرہ بالا ادیبوں کے علاوہ جن لکھنے والوں نے بچوں کے لئے اس موضوع پر کام کیا ہے اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے:

نام کتاب	مصنف
۱۔ سرکارِ مدینہؐ	چراغ حسن حسرت
۲۔ حیات النبیؐ	" "
۳۔ سرکارِ دو عالمؐ	غلام رسول مہر
۴۔ رسول عربیؐ	عبدالسلام خورشید
۵۔ سراپائے رسولؐ	اعجاز الحق قدوسی
۶۔ سید الانبیاءؐ	غلام ربانی عزیز
۷۔ ہمارے نبیؐ	نواب علی
۸۔ پیارے رسولؐ	افضل حسین
۹۔ اسلامی کہانیاں	انعام اللہ ناصر
۱۰۔ اسوۂ حسنہ	احمد عبداللہ المدوسی
۱۱۔ رسول پاکؐ	عبدالحفیظ
۱۲۔ سرور کائناتؐ	ساحل بلگرامی
۱۳۔ پیارے رسولؐ کیسے تھے	نائل خیرآبادی
۱۴۔ معراج شریف	عبدالصمد صارم
۱۵۔ محمد رسول اللہ	اکرام قمر
۱۶۔ ہمارے نبیؐ	بیگم ایچ آئی احمد

بچوں کے لئے سیرت پر نہ صرف نثر کی کتابیں ہی تصنیف نہیں کی گئیں، شاعروں نے بھی حضور اکرمؐ کی مبارک زندگی اور آپؐ کی تعلیمات کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے یہ ساری منظومات بچوں کے رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ سیرت کے ادب میں ان نظموں کی اہمیت بھی واضح ہے۔ بچوں نے ان کے ذریعے سرکارؐ کی زندگی اور آپؐ کے اخلاق و کردار کے بارے میں بہت کچھ معلوم کیا ہے؛ ذیل میں صرف دو شاعروں کی نعتوں کا اقتباس پیش کر رہا ہوں:

itsurdu.blogspot.com

وہ حق کی بات بتانے والے — وہ سیدھا راستہ دکھانے والے
وہ راہبر رہنما ہمارے — نبی ہمارے نبیؐ ہمارے

درود ان پر سلام ان پر — صوفی تبسم

دکھائی ہمیں راہ اسلام کس نے — سنایا ہمیں حق کا پیغام کس نے
ہمارے نبیؐ نے ہمارے نبیؐ نے

محبت کی یہ ریت کس نے سکھائی — کہ انسان سب بن گئے بھائی بھائی
ہمارے نبیؐ نے ہمارے نبیؐ نے

شفیع الدین نیّر

متذکرہ بالا سطور سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اردو میں بچوں کے لئے سیرت کا ادب یوں ترکیت کے لحاظ سے بہت زیادہ نہیں لیکن جہاں تک کیفیت کا تعلق ہے اس کی اہمیت مسلم ہے اس ادب نے ہمارے بچوں کو سرکار دو عالمؐ کی پُر وقار زندگی اور آپؐ کے عظیم اخلاق و کردار سے بخوبی واقف کرایا ہے۔

سیرت کی کتابوں نے نوعمر افراد کے ذہن و دل میں رسول اکرمؐ کی محبت اس طرح قائم کی ہے کہ آج مغربی تہذیب کی باد سموم بھی گلہائے عقیدت کو کملا نہیں سکتی۔ پیارے نبی کی الفت ہر بچے کے دل میں ابدالآباد تک کے لئے قائم ہو گئی ہے ؂

بچوں کا ادب ـــــ کہانی

ـــــ میرزا ادیب

کہانی کہنا اور کہانی سننا ایک ایسا عمل ہے جس کا آغاز موسیقی اور رقص کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ بلکہ ایک نظریہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ کہانی موسیقی اور رقص سے پیشتر ظہور پذیر ہوئی تھی اور جو محققین اس نظریے کے حامی ہیں وہ کہتے ہیں کہ جب کرۂ ارض پر انسان نے مل جل کر رہنا شروع کیا تو اس وقت مرد تو قوت لایموت کے حصول کی خاطر غاروں سے باہر نکل کر جانوروں کے شکار میں مصروف ہو جاتے تھے اور ان کی عورتیں دل بہلانے کی خاطر اپنے مردوں کے شکار کے واقعات سنایا کرتی تھیں یہ واقعات وہ جس انداز سے، اپنے تخیل سے کام لے کر جس مبالغے سے اور آوازوں کے زیر و بم کے علاوہ آنکھوں، ہاتھوں اور ٹانگوں کی حرکتوں کے ساتھ جس طور سے بیان کرتی تھیں ـــ اس سارے طریق کار کو کہانی کی ابتدائی صورت تصور کیا جاتا ہے۔

کہانی سے نسل انسانی کی دلچسپی ایک فطری امر ہے اور دنیا کا کوئی ایسا معاشرہ ملک یا خطۂ ارض ایسا نہیں ہے جہاں کہانی کسی نہ کسی شکل میں موجود نہیں ہے۔ فرق یہ ہے کہ جو قومیں ترقی کے مدارج و مراحل سے گزر چکی ہیں ان کی کہانیاں ان کے ادب کا ایک نمایاں حصہ بن گئی ہیں اور ہم ان میں سے اکثر کہانیوں کو اپنی اپنی زبان میں بھی پڑھ سکتے ہیں اور جو معاشرے نوشت و خواندگی صلاحیتوں سے ابھی تک محروم ہیں ان کی کہانیاں سینہ بہ سینہ سفر طے کرتی رہتی ہیں اور اگر یہ کہانیاں ہم تک پہنچی بھی ہیں تو ان لوگوں کی زبانی ہیں جن کا تعلق ان معاشروں سے نہیں ہے بلکہ سیاحوں، تذکرہ نویسوں اور سفرنامہ نگاروں کے توسط سے، ان کہانیوں کے مطالعے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ جو کہانیاں سنتے سناتے ہیں ہم سے کس قدر مختلف ہیں اور وہ تہذیبی لوازم جن سے ہماری کہانیاں بھرپور

itsurdu.blogspot.com

ہیں ان سے ان کہانیوں کو دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

کہانی بڑوں کے لئے ہو یا چھوٹوں کے لئے، اس کا لازمی اور بنیادی تعلق اپنے معاشرے سے، اپنے عہد سے اور اپنے جغرافیائی کوائف سے ہوتا ہے۔ کردار تو خیر ہر قوم اور ہر ملک کے اپنے ہوتے ہی ہیں۔ ان کے علاوہ ہر کہانی کی اپنی مقامیت ہوتی ہے جس سے اس کا تشخص واضح ہوتا ہے۔

اُردو ادب ـــــ جہاں تک کہانی کا واسطہ ہے۔ دنیا کے کسی ادب سے بھی پیچھے نہیں۔ اس طرح جب ہم ان کہانیوں پر نظر ڈالتے ہیں جو بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کہانیاں فنی خوبیوں کے لحاظ سے نہ سہی، مقدار اور تنوع کے اعتبار سے ایک گراں قدر ذخیرے کی حیثیت رکھتی ہیں اور پچھلی پون صدی میں بچوں کے لئے جتنا ادب پیش کیا گیا ہے اس کا بہت بڑا حصہ کہانیوں پر مشتمل ہے۔

اردو میں انیسویں صدی کے ربع آخر میں ہمارے بزرگوں نے بچوں کے لئے جو کہانیاں لکھی تھیں وہ ایک متعینہ مقصد کے زیر اثر لکھی گئی تھیں، ان کے مصنف تھے مولوی نذیر احمد، خواجہ الطاف حسین حالی، مولوی محمد حسین آزاد، راشد الخیری ـــ انہوں نے جو کہانیاں لکھی تھیں۔ وہ دلچسپ نہیں ہیں مگر سب کی سب نصیحت آموز ضرور ہیں اس زمانے میں بچوں کے لئے لکھنے والوں سے یہ توقع نہیں رکھ سکتے۔ کہ وہ ان ذرائع سے واقف ہوں جن سے موجودہ ترقی یافتہ دور کے کہانی کار پوری طرح آگاہ ہیں۔

ان بزرگوں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اگر نصیحت براہ راست کی جائے تو اس کا وہ اثر نہیں ہو سکتا جو بالواسطہ نصیحت سے ہوتا ہے اگر آپ اس زمانے کے نصابوں پر نظر ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ ہمارے یہ کہانی لکھنے والے صرف کہانی لکھ دینے پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ کہانی کے اختتامی حصے میں یہ بھی بیان کر دیتے تھے۔ کہ اس کہانی سے یہ نتیجہ نکلا کہ لالچ بُری بلا ہے وغیرہ وغیرہ

سید امتیاز علی تاج کے والد بزرگ سید ممتاز علی اور ان کی شریک حیات محمدی بیگم نے بچوں کی تربیت کی طرف خصوصی توجہ دی تھی۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے انہوں نے بچوں

کے لئے پھول کے نام سے ایک پرچے کا اجرا بھی کیا تھا جو مدت تک بڑی باقاعدگی سے اشاعت پذیر ہوتا رہا۔ اس زمانے میں رنگ محل مشن ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر رگوناتھ سہائے نے بھی "گلدستہ" کے نام سے ایک پرچہ جاری کیا تھا ان دونوں پرچوں میں زیادہ تر کہانیاں ہی چھپتی تھیں۔

یہ کہانیاں پہلی کہانیوں سے اس بنا پر کچھ الگ تھلگ محسوس ہوتی ہیں کہ ان کے لکھنے والوں نے ایک تو نصیحت کو براہ راست اپنے پڑھنے والوں کے ذہنوں میں اتارنے کی کوشش نہیں کی، اور دوسری بات یہ ہے کہ کہانیاں سپاٹ نہیں ہیں۔ پڑھنے اور سننے میں لطف دیتی ہیں۔

بچوں کی تربیت کا خیال ان کہانیوں لکھنے والوں کو بھی تھا مگر ان کا طریقہ کچھ سٹیٹیک تھا وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ اگر کونین کی گولی کو شہد میں لپیٹ کر دیا جائے تو یہ کام دہن میں تلخی پیدا کئے بغیر حلق سے نیچے اتر جاتی ہے اور معدے میں جا کر اپنا اثر دکھاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں اگر نصیحت کرنے کا وہی طریقہ آزمایا جائے جو انسانی فطرت سے کچھ مطابقت نہیں رکھتا تو بچے ان براہ راست نصیحت والی کہانیوں کو دلچسپی سے نہیں پڑھتے اور جب دلچسپی سے پڑھتے ہی نہیں تو اس کا اثر کیا ہوگا۔

بچوں کے لئے پچھلے ۲۰/۲۵ برسوں میں جو کہانیاں لکھی گئی ہیں ان کو اگر ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو پوری ایک لائبریری بن سکتی ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے ان کہانیوں کو زیادہ تر کئی دائروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ابتداً ان کہانیوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو اردو، عربی، سنسکرت، فارسی اور دنیا کی دوسری کلاسیکی کتابوں سے لی گئی ہیں اس کی کئی صورتیں سامنے آتی ہیں۔

یہ کہانیاں براہ راست دوسری زبانوں سے نہیں لی گئیں اور وہ کتابیں جن سے ان کہانیوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ کافی مدت پہلے اردو میں منتقل ہو گئی تھیں۔ مثلاً سنسکرت کی پنچ تنتر، عربی کی الف لیلیٰ، فارسی کی گلستان، بوستان اور باغ و بہار وغیرہ بچوں کے لئے لکھنے والوں نے ان کتابوں کی کہانیوں کو اخذ و ترمیم کے بعد آسان اور

itsurdu.blogspot.com

سلیس اردو میں لکھ دیا ہے ایک ایک کہانی کو کئی کئی مصنفین نے تحریر کیا ہے ان میں سے بیشتر کہانیاں، ان کے مرکزی کرداروں کے ناموں کے ساتھ منظر عام پر آتی ہیں مثلاً حاتم طائی پہلے، دوسرے، تیسرے اور چوتھے درویش کی الگ الگ کہانی، گل بکاؤلی، علی بابا چالیس چور، عمر عیار، ہرکلیز، اوڈیسس، وغیرہ۔

اردو کے داستانی ادب سے کہانیوں کی ایک بہت بڑی تعداد بچوں کے لئے موجود ہے۔ شیخ چلی کی کئی کہانیاں ہیں، سندباد جہازی کے کئی سفرنامے ہیں۔ علی بابا اور الہ دین کا چراغ کی کہانیاں ہیں۔ رستم اور سہراب، امیر حمزہ، عمر عیار، ملکہ صبا، سکندر اعظم اور اس قسم کے دوسرے تاریخی اور غیر تاریخی کرداروں کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں۔ پنچ تنتر سنسکرت ادب کی بڑی مشہور اور پرانی کتاب ہے۔ شاید ہی دنیا کی کوئی زبان ہوگی جس میں اس کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔ اسے اردو زبان میں متعدد ناولوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ افوار سہیلی سب سے مقبول ترجمہ ہے۔ بچوں کے مصنفین نے عموماً اس ترجمے سے کہانیوں کا انتخاب کیا ہے۔

یہی حال الف لیلیٰ کا بھی ہے۔ سید ابو تمیم نے بچوں کی الف لیلیٰ کے نام سے پوری کتاب لکھی ہے۔

داستان امیر حمزہ بھی بچوں کے ادب میں موجود ہے۔ قصہ چار درویش بھی کتابی صورت میں پیش کر دیا گیا ہے۔

ان کرداروں کو کلاسیکی داستان سے نکال کر موجودہ معاشرے میں بھی پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کردار وہی رہتے ہیں مگر ان کے واقعات ماحول، فضا اور حالات موجودہ دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ عموماً ان کرداروں کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ ان کی روداد پڑھ کر ہنسی آتی ہے یہ کردار اپنی دنیا سے نکل کر جب ہماری دنیا میں آتے ہیں۔ تو مزاح اور طنز کا سامان بنکر رہ جاتے ہیں۔ مثلاً یہ دیکھئے کہ حاتم طائی ایک بہت مشہور کردار ہے جس کی سخاوت — مہم جوئی اور انسان دوستی ایک مسلمہ حقیقت بن چکی ہے۔ مگر جب اس کردار کو موجودہ معاشرے میں لایا جاتا ہے تو اس سے ایسے ایسے

کام کروائے جاتے ہیں، جنھیں پڑھ کر انسان بے اختیار ہنس پڑتا ہے۔ اس نوع کی کوشش میں لے حمید اور طاہر لاہوری پیش پیش ہیں۔

الف لیلیٰ — جیسا کہ ظاہر ہے دنیائے قصص کی بڑی مشہور کتاب ہے۔ کرشن چندر نے چڑیوں کی الف لیلیٰ، دو حصوں میں لکھی ہے، جن میں قصے تو ہیں مگر الف لیلیٰ کے روایتی قصوں سے مختلف، چڑیوں کی الف لیلیٰ، انسانوں کی الف لیلیٰ تو ہو ہی نہیں سکتی۔ کرشن چندر کا مزاحیہ اور بیشتر طنزیہ رنگ غالب ہے۔ اس ضمن میں ان کا ذکر بھی ضروری ہے جو تاریخی حیثیت نہیں رکھتے لیکن بڑے مقبول ہیں مثلاً شیخ چلی، لال بجھکڑ، ملا نصیر الدین ان کے ساتھ جو کہانیاں وابستہ ہیں انہیں اردو میں بیان کر دیا گیا ہے اور بعض اوقات ان سے ایسی کہانیاں منسوب کر دی گئی ہیں جو پہلے موجود نہیں تھیں۔ صاف ظاہر ہے کہ لکھنے والوں نے یہ کہانیاں خود سوچی نہیں۔

آگے چلنے سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اردو اور دوسری کلاسیکی کتابوں میں سے جن اہل قلم نے کہانیوں کا انتخاب کر کے انہیں سلیقہ مندی کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے۔ ان میں مقبول جہانگیر، ذوالفقار احمد تابش اور محمد یونس حسرت کی کوششیں ناقابل فراموش ہیں۔

دوسرے دائرے میں بچوں کے لئے لکھی جانے والی وہ کتابیں شامل کی جا سکتی ہیں جو اپنے موضوع کے لحاظ سے اسلامی ہیں۔ یہاں کچھ کہانیاں قرآن مجید سے لی گئی ہیں کچھ اسلامی تاریخ سے اور کچھ بزرگوں کے حالات زندگی سے۔

کہانیوں کا یہ حصہ کافی پُر ثروت ہے۔

اسلامی تاریخی کہانیاں — اس نام سے محمد یونس حسرت نے کتاب لکھی ہے اس کے علاوہ چار ایسی کتابیں بھی ملتی ہیں جن کا نام ہے "اسلامی کہانیاں" ان کے مصنفین ہیں مقبول انور داؤدی، سلطان احمد وجودی، محمد یونس حسرت اور الیاس سیمی۔

تاریخ اسلام کی کہانیاں اور تاریخ اسلام کی سچی کہانیاں — یہ دو الگ کتابیں ہیں ایک اور کتاب بھی ہے "سچی اسلامی کہانیاں" ان کہانیوں کی سب سے بڑی قباحت یہ ہے

itsurdu.blogspot.com

کہ ایک ہی نام سے چار چار مصنفوں نے کہانیاں لکھ دی ہے۔ بہتر صورت یہ تھی کہ ہر مصنف کتاب کی اشاعت سے پہلے یہ دیکھ لیتا کہ اس نام سے پہلے کتاب تو نہیں چھپ گئی اس سے پڑھنے والوں کے لئے انتخاب کتاب میں آسانی رہتی۔

اسلامی کہانیوں کے مصنفین کے پیش نظر یہ واضح مقصد رہا ہے کہ وہ قوم کے بچوں کو اسلامی تاریخ کے ان واقعات اور ان کرداروں سے روشناس کرائیں جنھوں نے اخلاقی فضائل پھیلانے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ یہ مقصد ہر اعتبار سے قابل قدر ہے مگر رہ رہ کر اس بات پر افسوس ہوتا ہے کہ مقصد کی بلندی سے قطع نظر زیادہ کہانیاں ایسی ہیں جنھیں بچے دلچسپی کے ساتھ پڑھ سکیں۔ کہانی تاریخی ہو یا معاشرتی — بہرحال کہانی ہوتی تھی۔ اور اگر یہ پڑھنے والے کی توجہ پوری اپنی طرف کھینچ نہیں سکتی تو کہانی کی سطح سے نیچے آکر محض ایک مضمون بن جاتی ہے۔

اسلامی کہانیاں لکھنے والوں میں نیاں ایم اسلم، نظر زیدی، مقبول انور داؤدی اور عبدالمجید بھٹی کے علاوہ ندیم صہبائی کے نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

بچوں کے مصنفین نے دنیا کے اکثر ملکوں کی کہانیاں یا تو اردو میں ترجمہ کی ہیں یا ان کی کہانیوں کے واقعات اپنی زبان میں بیان کر دیئے ہیں!

یہ کہانیاں تیسرے دائرے میں شامل ہوتی ہیں!

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے کہ دوسرے ملکوں کی کہانیوں کو یا تو مکمل طور پر اپنی زبان میں منتقل کر دیا گیا ہے یا انہیں اخذ و اقتباس کے بعد اردو میں پیش کیا گیا ہے۔

یہ کہانیاں ان ملکوں کی لوک کہانیاں بھی ہیں اور جدید کہانیاں بھی۔

دوسرے ملکوں کی کہانیوں کی جو کتابیں ہمارے یہاں ملتی ہیں وہ تین قسم کی ہیں بعض مجموعے ایسے ہیں جن میں صرف ایک ملک کی کہانیاں شریک کی گئی ہیں مثلاً چینی کہانیاں جاپانی کہانیاں، امریکی کہانیاں، فرانسیسی کہانیاں، ترکی کہانیاں، جرمنی کہانیاں۔

دوسری قسم کے مجموعے ان کی کہانیوں پر مشتمل ہیں جن میں صرف ایک ملک کی کہانیاں نہیں ہیں بلکہ متعدد ملکوں کی کہانیاں ہیں: "سورج کے ساتھ ساتھ" یہ ایک ایسا مجموعہ ہے

جس میں دنیا کے کئی ملکوں کی کہانیاں درج ہیں ان کہانیوں کے مترجم عشرت رحمانی ہیں۔

"آؤ بچو! سنو کہانی" یہ بھی اسی قسم کی مجموعہ ہے اور ان کہانیوں کو اردو میں کشور ناہید نے منتقل کیا ہے۔

"ملک ملک کی کہانیاں" یہ ایسی کہانیوں کا تیسرا مجموعہ ہے اس کے مترجم ریاض جاوید ہیں۔

اس سلسلے میں کسی غیر ملکی ممتاز مصنف کی منتخب کہانیاں بھی چھپ گئی ہیں۔ ہینز کرسچن انڈرسن ڈنمارک کا مصنف ہے اور غالباً بچوں کا مقبول ترین مصنف ہے اس کی کہانیاں دنیا کے بے شمار ملکوں میں ترجمہ ہو کر پہنچ چکی ہیں اور ہر ملک کے بچے ان کہانیوں کو انتہائی دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں، ہمارے ہاں انڈرسن کی بعض بہت مقبول کہانیوں کا ترجمہ ریاض جاوید نے کیا ہے — اور لوگوں نے بھی کیا ہے، مگر ریاض جاوید کی کہانیاں "انڈرسن کی کہانیاں" کے نام سے ایک مجموعے میں چھپ چکی ہیں۔ جرمنی کے گرم برادرز، کی کہانیاں بھی ایک مجموعے میں شامل ہیں۔ اور اس مجموعے کا نام ہے "جرمنی کی کہانیاں"۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس باب میں خاصا کام ہوا ہے لیکن ابھی کام کی بڑی گنجائش بھی ہے اور ضرورت بھی۔ ہم نے بیشتر یورپی اہل قلم کی کہانیوں سے اپنے ادب میں اضافہ کیا ہے۔

مشرق وسطیٰ، مشرق بعید اور افریقہ کے علاوہ اسلامی ملکوں کی کہانیوں کی طرف بھی توجہ کرنے کی ضرورت ہے ان کہانیوں کی صرف یہی غرض و غایت نہیں کہ بچوں کے لئے دلچسپی کا سامان مہیا کریں بلکہ یہ بھی کہ یہ کہانیاں جن ملکوں کی ہیں ان سے بچوں کے ذہنی روابط قائم ہو جائیں یہ ایک اہم مقصد ہے۔

کہانیوں میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہتا ہے ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ دوسرے ملکوں کی پرانی کہانیوں پر بھی مطمئن ہو کر نہ رہ جائیں۔ ان ملکوں کی جدید کہانیاں کو بھی اردو میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ چین کی پرانی کہانیوں کو ہم اپنی زبان میں لے آئے ہیں، یہ ایک مستحسن اقدام ہے مگر ضرورت اس امر کی ہے کہ نئے چین کی ان کہانیوں کا بھی

itsurdu.blogspot.com

توجہ کریں جنہیں نئے چین کے بچے پڑھتے ہیں اور سنتے ہیں۔

کہانیوں کی ایک اور قسم بھی ہے اور یہ قسم ہی تخیلی کہانیوں کی ــــ اور یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ ہمارے ہاں ان کہانیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

تخیلی کہانیوں کی بنیادی غرض و غایت یہ ہے اور یہی ہونی چاہیئے کہ ان کے مطالعے سے بچوں کے اندر تخیل کی وسعت اور گہرائی پیدا ہو۔ میں یہ بات ذرا وضاحت سے عرض کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

بچہ اپنے اردگرد جو کچھ دیکھتا ہے وہ محدود ہوتا ہے۔ چند چہرے، اپنا گھر، چھت، دیواریں، کھلونے، آنگن اور اس قسم کی دوسری اشیاء رات کے وقت جب نانی، دادی، ماں یا باجی اسے پرستان کی پریوں، پہاڑوں، چاند، ستاروں، ندی، دریاؤں، چشموں کی کہانیاں سناتی ہے تو اسے یہ لذت محسوس ہوتی ہے کہ وہ جس دنیا میں ہے وہ کتنی وسیع ہے اس میں کیسی کیسی چیزیں ہیں، کتنی شاندار، کتنی خوبصورت، کتنی پیاری۔ یہ کہانیاں اس کے تخیل کو تیز و متحرک کرتی ہیں۔ اور خوشی کا ایک انجانا احساس اس کے اندر جاگ اٹھتا ہے جب اسے کسی بہادر شہزادے کی ایسی کہانی سنائی جاتی ہے جو کالے دیو یا کسی ایسی ہی ہستی کو شکست دیکر شہزادی کو اس قید سے نجات دلاتا ہے تو بچہ غیر شعوری طور پر خود کو ایک ایسا ہی شہزادہ تصور کرنے لگتا ہے۔ اس سے اس کے اندر بہادری اور جرأت کے جذبات کی پرورش ہونے لگتی ہے۔ جب کہانی اسے بتاتی ہے کہ شہزادے نے دیو پر فتح پائی تھی تو اسے شروع ہی میں یہ احساس ہو جاتا ہے کہ اس دنیا میں اچھے لوگ ہی نہیں برے لوگ بھی ہیں اور اچھے لوگ برے لوگوں کو شکست دے دیں۔ یعنی نیکی بدی پر غالب آ کر رہتی ہے۔

بچے کا کائنات سے اولین رابطہ کہانیوں ہی کے ذریعے ہوتا ہے۔ پرندوں کی کہانیاں پریوں کی کہانیاں، درختوں، پھولوں کی کہانیاں ــــ یہ اور اس قسم کی اور کہانیاں اسے احساس دلاتی ہیں کہ اس کے اردگرد کیا کچھ ہے اور یہ سب کچھ کتنا پیارا ہے۔

رات کو جب اسے چاند کی کہانی سنائی جاتی ہے تو وہ جب سونے لگتا ہے تو

محسوس کرتا ہے کہ وہ خود چاند پر پہنچ گیا ہے۔ کہانیوں کے سارے کردار اس کے تخیلات میں گھومتے پھرتے، حرکت کرتے رہتے ہیں۔

جیسے جیسے اس کی عمر بڑھتی جاتی ہے، اس کا تخیل وسیع ہوتا جاتا ہے ان کہانیوں کے اثرات اس کے ذہن پر مرتسم ہو جاتے ہیں۔ یہ اثرات آہستہ آہستہ زندگی کے بارے میں اس کے رویوں کی تشکیل کرتے رہتے ہیں۔

شہزادوں کی کہانیاں ہوں یا جنوں پریوں یا دیووں کی ــــ ان میں دہشت انگیز مناظر بھی بیان کئے جائیں گے مگر یہاں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے کہ اگر بچہ صرف دہشت کے اثرات قبول کرے تو یہ اثرات اس کی ذہنی نشوونما کے لئے ناخوشگوار ثابت ہوں گے۔ اپنے نتائج کے اعتبار سے۔ اس لئے مصنف کے لئے یہ بے حد ضروری ہے کہ وہ بہادری اور جرأت کے کارناموں کو خوف و دہشت والے مناظر اس طرح حاوی کر دے کہ بچہ غیر شعوری طور پر اپنے اندر جرأت مندانہ اثرات قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کرے، نہ صرف پیدا کرے بلکہ انہیں ترقی بھی دیتا رہے۔

بہادری جرأت مہم جوئی کے اثرات بچے میں اس طرح پیدا نہیں ہوتے کہ ہم اسے ایسی کہانیاں سنا دیں جن میں بہادری کے واقعات شامل ہوں۔ یہ مقصد سلیقہ مندی اور ہنر مندی کے ساتھ ساتھ اس امر کا بھی تقاضا کرتا ہے کہ جو شخص یہ کہانیاں لکھے وہ بچے کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے بھی پوری طرح واقف ہو۔ بچہ کس حال میں کیا قبول کیا ہے کس طرح قبول کرتا ہے اس کے تخیل کو کس طرح متحرک کیا جا سکتا ہے۔ اس کے اندر بعض چیزیں قبول کرنے اور بعض چیزیں رد کرنے کی صلاحیت کس طرح پیدا کی جا سکتی ہے ــــ کہانی لکھنے والے کو ان باتوں کا علم ہونا چاہیئے۔ بغیر اس علم کے وہ اچھی کہانی نہیں لکھ سکتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہانی لکھنا غالباً دنیا کا سب سے سہل کام ہے چند واقعات کو ترتیب دے دیا جائے تو یہ کہانی بن جاتی ہے اور بچہ ایسی کہانی کو شوق سے سن بھی سکتا ہے۔ پڑھ بھی سکتا ہے۔ مگر کہانی ایک نہایت مشکل کام بھی ہے اور وہ اس

itsurdu.blogspot.com

بنا پر کہ مصنف کا یہ بھی فرض ہونا چاہیئے کہ وہ دیکھے اس کی کہانی بچے پر کیا اثر ڈالتی ہے جب وہ اس طرف توجہ کرے گا تو لازماً وہ ایک نصب العین متعین کر کے کہانی لکھے گا اور جب یہ نصب العین متعین ہو جائے گا تو وہ کوشش کرے گا کہ وہ سارے تقاضے پورے کرے جو اس نصب العین کے حصول میں مدد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

آج کل جو جاسوسی، مہماتی، تخیلی کہانیاں بے تحاشا لکھی جا رہی ہیں۔ ان سے بچوں کے ادب میں تو یقیناً اضافہ ہو رہا ہے۔ مگر یہ کہانیاں اپنے پڑھنے والوں کی ذہنی نشو و نما پر نہایت مضر اثرات ڈال رہی ہیں۔ یہ کہانیاں فنی لحاظ سے بھی بہت کمزور ہوتی ہیں۔ بچوں کے ذہنوں میں شروع ہی سے یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ کہانی لکھنے والے نے گپ ہانکی ہے ـــــ اس احساس کے ساتھ جب بچہ کہانی پڑھے گا تو اس کی اپنی ذہنی کیفیت کیا ہوگی؟ وہ کہانی سے کیا اثر قبول کرے گا۔

کہانی لکھنے والے کو سب سے پہلے بچے کے دل میں یہ یقین پیدا کرنا چاہیئے کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ اور جب بچے کو یہ یقین ہو جائے گا کہ وہ جھوٹ موٹ کے واقعات نہیں سن رہا یا پڑھ رہا ہے۔ تو اس کی کہانی میں جو کچھ بتایا جائے گا اس کے ذہن پر ضرور اثر چھوڑے گا ـــــ مثلاً یہ کہانی میں یہ بتایا گیا ہے کہ لڑکے نے جن یا دیو پر فتح پالی ہے ـــــ تو بچے کے اپنے ذہن میں یہ یقین پیدا ہو جائے گا کہ جو لڑکا بھی بہادری دکھائے گا وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔

واقعات کی سچائیوں کا یقین دلانا مصنف کا فرض ہونا چاہیئے۔ بچوں کے لئے جو بھی کہانی لکھی جائے یہ اس کی بنیادی شرط اور ضرورت ہونی چاہیئے۔

تحیر آفرینی کہانی کا جزو لاینفک ہونا چاہیئے مگر یہ تحیر ـــ صرف تحیر کی خاطر نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اس کا نتیجہ ہونا چاہیئے کہ بچے کے اندر ولولہ انگیز لذت پیدا ہو۔ اس کے سینے میں نئی نئی امنگیں جاگیں۔ اس کے ذہن میں ایک مہم جویانہ آرزو کروٹیں لینے لگے۔

جاسوسی، مہماتی اور طلسماتی کہانیوں کا یہی اثر ہونا چاہیئے اور یہ اثر بچے پر اسوقت مرتب ہو سکتا ہے جب ان کہانیوں کا مصنف اپنے مقصد سے اچھی طرح واقف ہو اور

اس بات سے بھی آگاہ ہو کہ یہ مقصد کس طرح پورا کیا جا سکتا ہے۔

کہانی بنیادی طور پر کہانی ہوتی ہے ـــ اور اسے کہانی ہی ہونا چاہیئے اور کہانی وہی ہوتی ہے جسے دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے۔ دلچسپی کے ساتھ سنا جائے۔ دلچسپی اور مقصدیت کو آپس میں اس طرح مدغم ہونا چاہیئے کہ ان میں سے کسی کو الگ کرنا ناممکن امر ہو۔

کہانیوں کی ایک اور قسم بھی ہے جو حال ہی میں منظر عام پر آئی ہے یہ کہانی سائنس فکشن کے ذیل میں آتی ہے جہاں تک میں مطالعہ کر سکا ہوں۔ مجھے ان کہانیوں میں کوئی جان نظر نہیں آئی۔ اصل میں قصہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں ابھی سائنسی تجربات غالباً اولین مرحلے سے بھی نہیں گزرے۔ نتیجتاً ایسا ماحول نہیں بنا جس میں سائنس فکشن عمومی دلچسپی کی چیز بن سکے نقالی سے بات نہیں بنتی۔

ہمارے ہاں لطیفوں کی تو کمی نہیں ـــــ لیکن مزاحیہ کہانیاں بہت کم تعداد میں لکھی گئی ہیں ـــــ مے دے کے سعید لخت نے خوب صورت اور کامیاب مزاحیہ کہانیاں لکھی ہیں۔

آخر میں دو تین باتوں کی طرف اشارہ کرنا لازمی خیال کرتا ہوں۔

اردو میں بچوں کے لئے لاتعداد کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ مگر ان میں بہت کم تعداد ایسی کہانیوں کی ہے جو دلچسپی کے لحاظ سے بھی کامیاب رہی اور مقصدیت کے اعتبار سے بھی انہیں قابل مطالعہ گردانا جائے اور یہ اس وجہ سے ہوا ہے کہ لکھنے والوں نے فرض شناسی کا ثبوت نہیں دیا۔

کہانی لکھتے وقت بہر صورت ان امور کا خیال رکھنا چاہیئے:

الف: کہانی دلچسپ ہونی چاہیئے۔ یہ چھوٹے بچوں کے لئے ہو یا بڑے بچوں کے لئے۔ آگے کیا ہوگا؟ یہ سوال دلچسپی کو برقرار رکھتا ہے۔

ب۔ کہانی لکھتے وقت یہ سوچ لینا چاہیئے کہ لکھنے والا کس عمر کے بچوں کے لئے کہانی لکھ رہا ہے۔ عمر میں تفاوت کا مسئلہ بچوں کی کہانی سننے سمجھنے اور لطف اٹھانے کی ذہنی صلاحیت کا مسئلہ ہوتا ہے۔

itsurdu.blogspot.com

ج : کہانی میں واقعات بیان کئے جائیں انہیں بچوں کے ذہنوں پر منفی اثر نہیں ڈالنا چاہیئے مثلاً یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ کہانی میں دہشت انگیز عنصر کو اس قدر اہمیت دی جائے کہ پڑھنے والے دہشت زدہ ہو کر رہ جائیں۔

د : جب ہم کہتے ہیں کہ بچوں کی کہانی کو اصولاً بچوں کی کہانی ہونا چاہیئے تو اسکا صرف یہ مقصد نہیں ہوتا کہ زبان آسان اور سلیس ہو بلکہ یہ بھی کہانی میں جو کچھ بیان کیا جا رہا ہے وہ ان بچوں کی ذہنی صلاحیت سے فطری مطابقت رکھتا ہے جن کے لئے یہ کہانی لکھی جانی مطلوب ہے۔

ر : کہانی تخیلی ہو تو کوئی حرج نہیں، مگر لکھنے والے کو اسے اس انداز سے لکھنا چاہیئے کہ سننے پڑھنے والے بچے اسے جھوٹ موٹ نہ سمجھیں۔ کہانی میں حقیقت پسندی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مصنف سامنے کی بات لکھ دے۔ یہ انداز فکر و نظر تخیل میں رفعت و وسعت پیدا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ کہانی کار کا فن یا فنی کمال یہ ہے کہ وہ پڑھنے والوں یا سننے والوں میں یہ احساس جگا دے کہ وہ جو کچھ لکھ رہا ہے یا کہہ رہا ہے وہ سچائی ہے۔

س : ہمارا عہد تسخیر قمر کا عہد ہے۔ تسخیر کائنات کا عہد ہے اس عہد میں بے سروپا اور تخیل زدہ کہانیوں کی گنجائش نہیں ہے۔ ہمارا ملک ایک ترقی پذیر ملک ہے۔ تاہم ایسے ملکوں میں زیادہ فاصلے نہیں رہے۔ اس دور میں جو بچے سانس لے رہے ہیں وہ ذہناً پہلی نسلوں کے بچوں سے اگر بہت حد تک نہیں تو کافی حد تک ضرور مختلف ہیں۔

ش : اور آخری بات جو عرض کروں گا وہ یہ ہے کہ پاکستانی بچوں کے لئے پاکستانی کہانی ہونی چاہیئے۔ یہ جملہ ذرا وضاحت کا محتاج ہے۔ پاکستانی کہانی سے میری مراد یہ ہے۔ کہ اس کہانی میں اپنے ملک کی سرزمین کا ذکر ہونا چاہیئے۔ اپنی تاریخ اپنے جغرافیے کا ذکر ہونا چاہیئے۔ اپنے لوگوں اور اپنے کلچر کا ذکر ہونا چاہیئے۔ تخیلی کہانیوں کا زمانہ بیت گیا ہے۔

بچوں کے لئے شاعری

محمد امجد

کلاسیکی اردو ادب کی بنیاد جن تہذیبی تصورات پر تھی وہ جدید تہذیبی تصورات سے بالکل مختلف تھے۔ کلاسیکی معاشرہ زندگی کو ایک عظیم وحدت کی شکل میں دیکھتا تھا اور زندگی کی مختلف سطحیں اس تصور کے ذریعے آپس میں مربوط ہو جاتی تھیں۔ روایتی معاشرے کا طرز تعلم بھی موجودہ طرز تعلم سے مختلف تھا۔ اس طرز تعلیم میں وجدانی پہلوؤں پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ چونکہ کلاسیکی ادب بیک وقت زندگی کی مختلف سطحوں سے مربوط ہوتا تھا اس لئے وہاں پر بچوں کے ادب اور بڑوں کے ادب کی اس طرح تمیز نہیں کی جاتی تھی جیسے موجودہ زمانے میں کی جاتی ہے۔ مختلف حکایتیں، قصے اور تمثیلیں وغیرہ بیک وقت بچوں اور بڑوں کے لئے معنویت رکھتی تھیں اور اپنے اپنے درجے کے مطابق تمام لوگ ان میں دلچسپی لے سکتے تھے۔

مشرقی تہذیبوں کا تصور اخلاق بھی اس تہذیبی [illegible] میں سمجھا جا سکتا ہے۔ سعدی کی "گلستان" بچوں کے لئے بھی اور بڑوں کے لئے بھی اخلاق و دانش کا منبع سمجھی جاتی ہے البتہ کہیں ایسی کوششیں نظر آتی ہیں کہ کچھ تعلیمی مقاصد کے لئے شاعروں نے جدید یوں کے لئے یا بچوں کے لئے تحریریں لکھیں۔ ایسی چیزوں میں امیر خسرو کا رسالہ "خالق باری" مشہور ہے۔ جس کے بارے میں کچھ محققین نے اس شبے کا اظہار کیا ہے کہ اس رسالے کو امیر خسرو سے منسوب کرنا درست نہیں ہے اس طرح غالب کا رسالہ "قادر نامہ" اس روایت کی ایک اور شکل ہے اس میں بھی بچوں کو بعض الفاظ کا مطلب سمجھایا گیا ہے لیکن غالب نے اس میں اپنے حسن مزاح کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔

اردو شاعری میں بچوں کے لئے لکھی جانے والی نظموں کی باقاعدہ روایت ۱۸۵۷ء کے بعد دکھائی دیتی ہے۔ بچوں کے ابتدائی ادیبوں کا بنیادی مقصد اصلاحی اور تعلیمی تھا۔

itsurdu.blogspot.com

۱۸۵۷ء کے بعد وہ تہذیبی وحدت جس کی طرف شروع میں اشارہ کیا گیا ہے ٹوٹ چکی تھی۔ انگریزی تہذیب کی آمد نے قدیم مشرقی اقدار کے بارے میں شبہات پیدا کر دیئے۔ چنانچہ ہمارے معاشرے کے حساس افراد اپنے تہذیبی تصورات کو انگریزوں کے لائے ہوئے تہذیبی تصورات سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔ بخصوصاً تعلیم کے شعبے میں اس طرح کی کوششیں بہت زیادہ ہوئیں اور مختلف ادیبوں نے تعلیمی مقصد کے لئے ایسی کتابیں لکھیں جن میں نئی تہذیبی ضرورتوں کے تحت بچے کے ذہن کو تیار کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ اس دور میں بچوں کے لئے مختلف نظمیں اور تحریریں ملتی ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ ان لوگوں کے پیش نظر یہ حقیقت ضرور ہوگی کہ معاشرے میں جن اصلاحی رجحانات کو وہ عام کرنا چاہتے ہیں وہ اسی صورت میں آگے بڑھائے جا سکتے ہیں جب نئی نسل کو ان کے لئے تیار کیا جائے۔ بچپن کی تربیت کا انسان کی پوری شخصیت پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے اور اگر بچوں کو ابھی سے نئی تمدنی اور تہذیبی ضرورتوں سے آشنا کر دیا جائے تو آگے چل کر وہ نئی اقدار کے خلاف کسی قسم کی نفرت نہیں رکھیں گے۔ دوسری اہم وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس زمانے کی انگریز حکومت کی یہ ایک بنیادی پالیسی تھی کہ بچوں کے لئے تعلیمی کتابیں لکھوائی جائیں۔ چنانچہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس زمانے کے اکثر مصنفین جنھوں نے بچوں کے لئے تحریریں لکھیں کسی نہ کسی طرح محکمہ تعلیم سے وابستہ تھے یا انہوں نے یہ چیزیں محکمہ تعلیم کے ایماء پر لکھیں اور انہیں اس سلسلے میں انعام و اکرام سے نوازا گیا۔

بہرحال ان وجوہات کے زیر اثر اردو میں بچوں کے ادب کی ایک باقاعدہ روایت شروع ہوئی۔ ڈپٹی نذیر احمد نے چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت پر "بنات النعش" کے نام سے قصہ لکھا۔ مولانا محمد حسین آزاد اور حالی جس نیچرل شاعری کی تحریک شروع کر رہے تھے۔ اس میں سادگی اور زندگی کی روزمرہ حقیقتوں کو اہمیت دی گئی تھی اور بنیادی طور پر یہ تحریک اصلاحی نوعیت کی تھی۔ اس لئے اس تحریک کے شاعروں نے بچوں کے لئے قابل قدر تحریریں لکھیں۔

سرسید تحریک بنیادی طور پر اصلاحی اور مقصدی تحریک تھی اس لئے اس

کے لکھنے والوں نے اور نیز ان کے بعد آنے والوں نے اصلاحی مقاصد کے تحت بچوں کے لئے ادب پیدا کیا۔ جدید اردو شاعری جب حالی اور آزاد کے حوالے سے شروع ہوئی تو اردو شاعری میں پہلی بار موضوعات کے تنوع کے لئے فطرت نگاری شروع ہوئی۔ لہٰذا وہ موضوعات جن پر بچوں کے لئے نظمیں کہی گئیں۔ بیشتر اصلاح احوال، اصلاح اخلاق، فطرت کے مختلف پہلو اور درس و عمل سے متعلق تھے۔

حالی، آزاد اور اسمٰعیل میرٹھی کے ہاں بچوں سے متعلق جو نظمیں ملتی ہیں ان میں سے اکثر فطرت کے موضوعات پر ہیں لیکن فطرت نگاری کے ساتھ ساتھ ان نظموں کے آخر میں عملی اخلاقیات کا کوئی نہ کوئی درس ضرور شامل ہوتا ہے۔ مقصدی اور اصلاحی تحریک کے ردعمل کے طور پر اردو ادب میں رومانوی تحریک شروع ہوئی۔ رومانوی تحریک کے زیر اثر بچوں کے ادب میں بھی نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی۔ لہٰذا اب بچوں پر لکھی جانے والی نظموں میں ایسے موضوعات بھی شامل ہیں جو بچوں میں محض حیرت و استعجاب کے عناصر پیدا کرتے تھے ان میں کوئی اخلاقی درس نہیں ہوتا تھا۔ حامد اللہ افسر کی اکثر نظمیں اسی قبیل کی ہیں۔

جدید دور میں بچوں کے لئے جو نظمیں لکھی گئیں ان میں صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کی نظمیں قابل ذکر ہیں۔ صوفی صاحب نے بچوں کی جو دنیا بنائی ہے وہ بڑوں کی دنیا سے بالکل مختلف ہے۔ بچوں کی دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے۔ بالغ لوگ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

میرزا ادیب ماہنامہ "کتاب" کے بچوں کے ادب نمبر میں لکھتے ہیں:

"۱۸۵۷ء کے بعد کا دور ایک اصلاحی دور تھا۔ تحریک آزادی ناکام ہو چکی تھی۔ وہ برصغیر کی تمام قومیں اپنی ساری توجہات اصلاح احوال پر مرکوز کر چکی تھیں۔ ہمارے مصنفین معاشرے کے ذمے دار افراد ہونے کی حیثیت سے بچوں کی بہتر طور پر تربیت کرنا چاہتے تھے اس مقصد کو عملی صورت دینے کی خاطر ایسی نظمیں لکھنے کی کوشش کرتے تھے جنہیں پڑھ کر بچے نیک بنیں اور زندگی کی اچھی قدروں کو عزیز گردانیں۔"

itsurdu.blogspot.com

اب ہم بچوں کی نظموں کے تدریجی ارتقاء کا مطالعہ کرتے ہوئے مختلف شاعروں کا جائزہ لیتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ انہوں نے کن کن خصوصیات کا مظاہرہ کیا ہے۔

سب سے پہلے ہم مولانا محمد حسین آزاد کا ذکر کرتے ہیں۔ محمد حسین آزاد اردو نثر کے صاحب طرز ادیب تھے وہ اپنی نثر میں استعاروں اور تمثیلوں کے ذریعے سے ایک ایسی فضا پیدا کرتے ہیں جس کی مثال اردو نثر کے کسی اور نمائندے کے ہاں نظر نہیں آتی وہ اپنی نثر میں تصویروں پر تصویریں بکھیرتے چلے جاتے ہیں اور قاری ان کے اسلوب کی چمک سے مسحور ہو جاتا ہے۔ آزاد بھی اپنے زمانے کے اصلاحی رجحانات سے متاثر تھے اور انہوں نے حالی کے ساتھ مل کر اردو شاعری میں موضوعات اور اسلوب کے لحاظ سے تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ ایک عجیب بات نظر آتی ہے کہ آزاد نثر میں تو استعاروں کا بکثرت استعمال کرتے ہیں لیکن نظم کے حوالے سے انہوں نے سادہ اسلوب کو پسند کیا ہے اس طرح ان کے فن میں تمثیلی عناصر بہت اہمیت رکھتے ہیں اور ان کی تصنیف "نیرنگ خیال" اردو میں تمثیلی مضامین کا نہایت اہم مجموعہ ہے اس طرح شاعری میں بھی انہوں نے مختلف تمثیلوں کے ذریعے سے اپنی بات کی وضاحت کی کوشش کی۔ اردو ادب میں آزاد کی کئی حیثیتیں ہیں اور ان سب کا ذکر ایک مختصر جائزے میں ممکن نہیں۔ زیر نظر جائزے میں ہماری دلچسپی ان کے فن کے اس رخ سے ہے جو بچوں کے ادب سے متعلق ہے اور اس سلسلے میں بھی آزاد کو کئی لحاظ سے ایک راہ نما کی حیثیت حاصل ہے۔ آزاد نے بچوں کے لئے جو "ریڈرز" لکھیں، وہ ایک عرصے تک نصابی کتب کے لئے ایک ماڈل یا نمونے کا کام دیتی رہیں۔ ان کتب میں جو بنیادی طور پر تعلیمی ضروریات کے لئے لکھی گئی ہیں۔ آزاد نے بچوں کی نفسیات اور ان کی ذہنی استعداد کو پیش نظر رکھا ہے۔ ان کتب کے جائزے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ آزاد کو بچوں کی نفسیات کا گہرا شعور تھا۔ وہ اس سلسلے میں خود لکھتے ہیں:

"بڑا حصہ عمر گراں بہا کا سررشتہ تعلیم کی ابتدائی کتابوں کی تصنیف میں صرف ہوا۔ وہ کتابیں نام کی ابتدائی ہیں مگر مجھ

سے انہوں نے انتہا سے بڑھ کر محنت کی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جب تک انسان خود بچہ نہ بن جائے، تب تک بچوں کے مناسب حال کتاب نہیں لکھ سکتا۔ پھر انہیں بار بار کاٹنا اور بنانا لکھنا اور مٹانا، بڈھا ہو کر بچہ بننا پڑا۔ پھرتے چلتے۔ جاگتے۔ سوتے بچوں کے ہی خیالات میں رہا۔ مہینوں نہیں بلکہ برسوں صرف ہوئے۔ جب وہ بچوں کے کھلونے تیار ہوئے خیر میرے پیارے اہل وطن! تمہاری خدمت نہ کی۔ تمہارے بچوں کی خدمت کی"[1]

آزاد کی ایک نظم "سچائی" کے چند شعر درج ہیں:

سُنا ہے کہ لڑکا تھا اک ہونہار — بہت اس کو ماں باپ کرتے تھے پیار
محبت سے دی ایک دن باپ نے — اک آری اُسے کھیلنے کے لئے
وہ آری کو لے کر بہت خوش ہوا — اسی وقت رستہ لیا باغ کا
وہاں ایک دو پیڑ ایسے بھی تھے — لگائے تھے جو باپ نے شوق سے
ہری ٹہنیاں جس قدر ان میں تھیں — وہ آری سے لڑکے نے سب کاٹ دیں

آزاد کی ایک بہت مشہور نظم "سویرے اٹھنا" کے کچھ شعر درج ہیں:

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی
عجب تھی بہار اور عجب سیر تھی
خوشی کا تھا وقت اور ٹھنڈی ہوا
پرندوں کا تھا ہر طرف چہچہا
یہی جی میں آئی کہ گھر سے نکل
ٹہلتا ٹہلتا ذرا باغ مل

---

[1] مکتوب محمد حسین آزاد۔ بحوالہ "اردو کی پہلی کتاب" مرتبہ ڈاکٹر اسلم فرخی ترقی اردو بورڈ: کراچی

itsurdu.blogspot.com

چھڑی ہاتھ میں لے کے گھر سے چلا
اور ایک باغ کا سیدھا رستہ لیا
وہاں اور ہی جا کے دیکھی بہار
درختوں کی ہے ہر طرف اک قطار
کہیں ہے چنبیلی کہیں موتیا
گلاب اور گیندا کہیں ہے کھلا
کھلے پھول ہیں اس قدر جا بجا
کہ خوشبو سے ہے باغ مہکا ہوا

اکبر الہ آبادی کی ایک نظم "آب لو ڈور" بھی بچوں کے لئے لکھی گئی۔ نظموں میں یہ ایک خاص تعلیمی اہمیت کی حامل ہے۔

اس دور میں بھی بچوں کے ادب کے سلسلے میں ایک اور نام اسمٰعیل میرٹھی کا ہے اسمٰعیل میرٹھی کو اس لحاظ سے فوقیت حاصل ہے کہ انہوں نے بچوں کے لئے بہت سی نظمیں لکھیں اور اردو میں بچوں کے ادب کے فروغ کے سلسلے میں زیادہ مربوط کوشش کی۔ اسمٰعیل میرٹھی کی نظموں نے بچوں کی کئی نسلوں کی تربیت کی ہے اور نسل بعد نسل بچے نصابی کتابوں میں ان نظموں کو پڑھتے رہیئے اور ان نظموں کے ذریعے گرد و پیش کی چیزوں اور کائنات کے مظاہر کے بارے میں ان کے تصورات بنتے رہے ہیں۔ اگرچہ زمانہ تبدیل ہو گیا ہے۔ اور معاشرتی حالات میں ایک عظیم انقلاب رونما ہو چکا ہے لیکن اسمٰعیل میرٹھی نے اپنی نظموں میں بچوں کے لئے جو کائنات تیار کی ہے۔ بچے آج بھی اس میں کشش محسوس کرتے ہیں۔ کیونکہ ان نظموں میں بچے کے ذہنی رجحانات کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔

اسمٰعیل میرٹھی نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ وہ کچھ لکھیں، وہ بچوں کے لئے ہو۔ بچوں کو تصویروں سے دلچسپی ہوتی ہے وہ تصویری کہانیوں اور نظموں میں انہماک سے کام لیتے ہیں۔ اسمٰعیل چونکہ مذہبی آدمی تھے اس حیثیت سے انہیں بچوں کی نفسیات سمجھنے میں کافی مدد ملی۔ بچوں کے مزاج سے مطابقت پیدا کرنے کا احساس اسمٰعیل میرٹھی کے یہاں کارفرما ہے

اور یہی ان کی کامیابی کی دلیل ہے اور یہ احساس دراصل عملی تجربے کا نتیجہ ہے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری اسمٰعیل میرٹھی کے متعلق لکھتے ہیں:

"ابتدا ہی سے اسمٰعیل کا تعلق درس و تدریس سے رہا تھا۔ اس لئے انہیں بچوں کی سمجھ اور ان کی نفسیات کے مطالعہ کا بڑا اچھا موقعہ ملا اور اس موقعہ سے اسمٰعیل نے جو فائدہ اٹھایا وہ بے حد قابل ستائش ہے۔"[1]

رب کا شکر ادا کر بھائی — جس نے ہماری گائے بنائی
اس مالک کو کیوں نہ پکاریں — جس نے پلائیں دودھ کی دھاریں
خاک کو اس نے سبزہ بنایا — سبزہ کو پھر گائے نے کھایا
رب کی حمد و ثنا کر بھائی
جس نے ایسی گائے بنائی

چند اشعار اسمٰعیل کی نظم "کچھوا اور خرگوش" سے بھی درج ہیں:

ایک کچھوے کے آ گئی جی میں — کیجئے سیر و گشت خشکی میں
جا رہا تھا ہوا خاموش — اس سے ناحق الجھ پڑا خرگوش
میاں کچھوے تمہاری چال ہے یہ — یا کوئی شامت اور وبال ہے یہ
یوں قدم پھونک پھونک دھرتے ہو — گویا زمین پہ کرتے ہو
کیوں ہوئے چل کے مفت میں بدنام — بے چلے کیا اٹک رہا تھا کام
تم کو یہ حوصلہ نہ کرنا تھا
چلو پانی میں ڈوب مرنا تھا

بچوں کے شاعر اسمٰعیل میرٹھی کو "محمود الرحمٰن" نے رسالہ "کتاب" کے بچوں کے ادب نمبر

---

[1] بحوالہ رسالہ "کتاب" بچوں کا ادب نمبر شمارہ نمبر ۴، صفحہ ۴۸
مکتبہ جدید پریس شاہراہ فاطمہ جناح، لاہور

itsurdu.blogspot.com

میں ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے :

"کلیات اسمٰعیل کے ابتدائی صفحات پر جو "پن چکی" بلی اور گائے کا ذکر کیا ہے وہ بیکار ہے اور یونہی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ ساری منظومات بڑی اہمیت کی حامل ہیں ان میں بچوں کی فطرت پوشیدہ ہے ان کی نفسیات کارفرما ہے ان موضوعات سے بچے محبت کرتے ہیں۔ یہ سب ان کے جانے پہچانے ہیں۔ اور اسمٰعیل میرٹھی کی یہی خوبی تو ہے کہ وہ ان موضوعات کو اپناتے ہیں جو بچوں کے آشنا ہیں۔ بچے جن سے مل کر خوش ہوتے ہیں جن کی قربت میں انہیں لطف و سرور ملتا ہے۔ اسمٰعیل صرف تین چیزوں کا ہی ذکر نہیں کرتے وہ ان دوسری چیزوں کا حال بھی بتاتے ہیں جن سے بچے بخوبی واقف ہیں۔ ان میں "کوا" بھی ہے جو روزانہ گھر کی دیوار پر بیٹھ کر کائیں کائیں کرتا ہے اور موقعہ دیکھتے ہی بچے کے ہاتھ سے روٹی اچک لیتا ہے۔ دوسرے جانوروں کا ذکر بھی ہے جو گھر کے آس پاس ہی رہتے ہیں۔ جیسے کتا، گھوڑا، جگنو"[1]

میرزا ادیب اسمٰعیل میرٹھی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :

"جہاں تک بچوں کے لئے شعری ادب کا تعلق ہے یہ بات پورے وثوق سے اعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ مولوی اسمٰعیل میرٹھی نے سب سے زیادہ کام کیا ہے۔ مولوی اسمٰعیل میرٹھی نے بچوں کے لئے سب سے زیادہ مقبول نظمیں لکھی ہیں ان کی نظموں کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ موجودہ دور میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جنھیں ان کے کافی شعر یاد ہیں اور جو یہ شعر حافظے کی مدد

[1] بحوالہ رسالہ "کتاب" بچوں کا ادب نمبر، شمارہ نمبر ۳ صفحہ ۴۹

سے یہ سہولت سنا سکتے ہیں ؎

اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

یہ مصرعہ کس کو یاد نہیں ہے اور حمد کے ایک نہیں کئی شعر کون نہیں سنا سکتا۔ میں جس زمانے میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا تو صبح کے وقت سب سے پہلے دو لڑکے حمد کا ایک مصرعہ گاتے تھے اور پھر سکول کے سارے طلبا یہ مصرعہ دہراتے ہیں :

تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا
کیسی زمین بنائی ! کیا آسماں بنایا
پیروں تلے بچھایا کیا خوب فرش خاکی
اور سر پہ آسماں کا اک سائباں بنایا

مولوی صاحب کی لکھی ہوئی نظموں میں اتنی روانی ہے اور انہوں نے چھوٹے چھوٹے لفظوں کو اتنی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے کہ صرف تین چار مرتبہ پڑھ لینے سے نظم کے دو تین شعر حافظے میں محفوظ ہو جاتے ہیں انہوں نے لفظوں کے موضوعات کے انتخاب میں گہری بصیرت اور سلیقہ مندی سے کام لیا ہے۔ جن سے بچے اچھی طرح واقف ہیں۔ بچوں کے لئے لکھی جانیوالی نظموں کا جب بھی ذکر آتا ہے اور جہاں بھی ذکر کیا جائے گا مولوی اسمٰعیل میرٹھی کا نام سرفہرست ہوگا اور یہ اس وجہ سے ہے کہ بچوں کے لئے جتنی پیاری نظمیں مولوی صاحب نے لکھی ہیں اور کوئی شاعر نہیں لکھ سکا[1]

سورج نرائن مہر نے بھی بچوں کے لئے بڑی خوب صورت نظمیں لکھی ہیں کسی زمانے میں اردو کا کوئی نصاب مہر کی دو تین نظموں سے محروم نہیں ہوتا تھا۔ سورج نرائن مہر کی نظمیں بچے بڑے ذوق و شوق اور دلچسپی کے ساتھ پڑھتے اور ان نظموں کو زبانی یاد کر لیتے تھے۔ بچوں کے ادب کے سلسلے میں سورج نرائن مہر کا نام کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ سورج نرائن مہر کے نام کے ساتھ ایک اور شاعر کا نام بھی نصاب میں احتراماً چھپتا

[1] بحوالہ رسالہ "کتاب" بچوں کا ادب نمبر، مئی ۱۹۷۸ء صفحہ ۶۲/۶۳

itsurdu.blogspot.com

رہتا تھا۔ اس شاعر کا نام "بے نظیر" ہے۔ یہ نام کچھ زیادہ معروف نہیں ہے۔ تاہم بے نظیر نے بچوں کے لئے بڑی عمدہ شاعری ہے اور بہت اچھی نظمیں لکھی ہیں۔

بچوں کی شاعری کے سلسلے میں تلوک چند محروم کا نام بھی امتیازی خصوصیت کا حامل ہے۔ اگر ہم تلوک کا بچوں کے ادب کے سلسلے میں ذکر نہ کریں تو یہ کم نگاہی اور بے ذوقی ہوگی۔ یہ اس لئے کہ تلوک چند محروم نے ساری عمر بچوں کے لئے لکھا ہے اور ہمیں اس سلسلے میں بڑی خوب صورت اور پیاری نظمیں دی ہیں۔ تلوک چند محروم نے زیادہ چھوٹے بچوں کے لئے نظمیں کہیں جیسے سورج رائن مہر، اسمٰعیل میرٹھی اور محمد حسین آزاد نے کہی ہیں۔ تلوک چند محروم کے مجموعہ کلام "گنج معانی" میں ثانوی درجوں کے بچوں کے لئے بڑی اچھی نظمیں خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ سر عبدالقادر نے "گنج معانی" کے دیباچے میں لکھا ہے:

"محروم نے چونکہ عمر بھر محکمہ تعلیم میں بسر کی ہے۔ خود ان کے کلام میں بہت سے حصے جوانوں اور بچوں کے لئے نصیحت آموز ہیں۔"[1]

سر عبدالقادر نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ محروم کے کلام کے بیشتر حصے جوانوں اور بچوں کے لئے نصیحت آمیز ہیں اور میں اس میں یہ اضافہ کروں گا کہ بچے اور جوان بلکہ بوڑھے بھی ان نظموں کو بڑی دل چسپی سے پڑھتے ہیں ان کے مجموعہ کلام "گنج معانی" کی پہلی نظم "توحید" ہے۔ اس کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

ہر ذرّے میں ہے ظہور تیرا
خورشید و قمر میں نور تیرا
افسانہ تیرا جہاں تہاں ہے
چرچا ہے قریب و دور تیرا
گاتے ہیں سحر ہوا میں کیا کیا
دم بھرتے ہیں سب طیور تیرا

---

[1] بحوالہ رسالہ "کتاب" بچوں کا ادب نمبر، مئی ۱۹۷۸ء صد ۶۳

تو جلوہ فگن کہاں نہیں ہے
وہ جا نہیں، تو جہاں نہیں ہے

ابوالاثر حفیظ جالندھری کا کام مختلف انواع و اقسام پر پھیلا ہوا ہے انہوں نے بڑوں کے لئے بہت کچھ لکھا ہے اور یہ بہت کچھ خاصا متنوع ہے اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے بچوں کے لئے جس قدر ادبی سرمایہ فراہم کیا ہے وہ بھی قابل قدر اور قابل تحسین ہے ان کی شاعری کی ایک خاص خوبی وہ داخلی ترنم ہے جو ایک بہر کی طرح ان کے ایک ایک مصرعے میں رچ بس گیا ہے۔ گویا غنائیت ان کی شاعری کی سب سے نمایاں خوبی ہے اور یہ بڑوں کی شاعری میں بھی ہے اور بچوں کی نظموں میں بھی۔ حفیظ جالندھری نے بچوں کے لئے درجوں کے حساب سے ترنم اور خوب صورت نظمیں لکھی ہیں۔ کچھ نظموں کے ٹکڑے پیش ہیں۔

"عہد" کے متعلق حفیظ جالندھری نے جو نظم کہی ہے اس میں بچوں کی اضطرابی کیفیت کا اظہار بھی کیا ہے:

ننھے بچے ہیں خاص کر مسرور
کہتے ہیں عید اب ہے کتنی دور
بچوں کی آنکھ میں ہے نیند کہاں
ہیں انھیں تو چڑھی ہوئی خوشیاں
ہو گئی رات کاٹنی مشکل
کل کے دن پر لگا ہوا ہے دل

ایک نظم "تاروں بھری رات" ہے۔ اس نظم کے اشعار میں بڑی غنائیت اور مٹھاس ہے:

ہے کیا چمک دار — "تاروں کا دربار"
پھیلے ہوئے ہیں — "تارے ہی تارے"
رہتے ہیں یوں تو — خاموش سارے
کرتے ہیں لیکن — باہم اشارے

بول "میرے مرغے" ایک بہت پیاری نظم ہے اس کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

itsurdu.blogspot.com

بول میرے مرغے ککڑوں کوں

خوب اکڑ کر چڑھ کھانچے پر
ہاں اب تن جا مرغا بن جا
اپنے بازو تول میرے مرغے
بول رے مرغے ککڑوں کوں

حامد اللہ افسر نے بھی بچوں کے لئے چند خوب صورت نظمیں کہی ہیں افسوس تو یہ ہے کہ ان کا مجموعہ کلام دستیاب نہیں ہے۔ "چاند" کے بارے میں حامد اللہ افسر کی ایک بہت ہی پیاری نظم ہے، اس کا ایک شعر درج ہے:

تم ندی پر جا کر دیکھو
جب پانی میں نہائے چاند

بہت کم لوگ یہ حقیقت جانتے ہیں کہ اختر شیرانی نے بچوں کے لئے نظموں کی ایک پوری کتاب چند روز میں مکمل کر دی تھی۔ اختر شیرانی کی نظموں کا یہ مجموعہ دارالاشاعت پنجاب سے شائع ہوا تھا اور یہ مجموعہ کسی لائبریری میں ہو تو ہو بازار میں نہیں ہے۔

علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے ابتدائی زمانے میں رومانی موضوعات پر نظمیں لکھیں ان کی ابتدائی شاعری میں فطرت کے خوب صورت مناظر نظر آتے ہیں۔ اس دور میں بچوں کے لئے شاعری پر بھی خصوصی توجہ دی ہے لیکن چونکہ ہم ان نظموں کا تفصیلی مطالعہ دوسرے باب میں پیش کریں گے۔ اس لئے یہاں علامہ اقبال کی شاعری کے اس رُخ کا تفصیلی ذکر نہیں ہو سکتا۔ اس دور میں حامد اللہ افسر اور بعض دوسرے شعرا نے بھی بچوں کے لئے عمدہ نظمیں لکھی ہیں۔

بیسویں صدی کے ابتدائی زمانے ہی سے اردو صحافت نے بھی خاصی ترقی کی اور بچوں کے لئے رسالے بھی شائع ہونے لگے۔ اس زمانے کے رسالوں میں "دارالاشاعت" پنجاب کا رسالہ "پھول" بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس رسالے سے امتیاز علی تاج، غلام عباس اور امجد نیم قاسمی جیسے مشہور ادیب وابستہ رہے اور اس رسالے سے بچوں کے ادب کو

کافی فروغ ملا۔ یوں تو دور جدید کے بہت سے شاعروں نے بچوں کے ادب کو اپنا موضوع بنایا لیکن خاص طور پر صوفی تبسم نے زیادہ مربوط انداز میں بچوں کے لئے نظمیں لکھیں صوفی صاحب نے اپنے نظموں میں بچوں کی کھلنڈری اور شوخ طبیعت کے تقاضوں کا بہت خیال رکھا۔ انہوں نے اس سلسلے میں مختلف ہیئتوں سے کام لیا ہے۔ انہوں نے بعض کردار بھی تخلیق کئے ہیں جنھیں بے حد شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اور خاص طور پر "ٹوٹ بٹوٹ" کا کردار بچوں کا ایک مستقل ساتھی بن گیا۔

صوفی تبسم کی بچوں کے لئے نظموں کا مجموعہ "جھولنے" کے نام سے شائع ہوا اور بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ دور میں بچوں کے لئے لکھی گئی شاعری میں بہت کم لوگوں کو ایسی شہرت نصیب ہوئی جو اس مجموعے کے حصے میں آئی۔ صوفی صاحب کی ان نظموں کے موضوعات اور ان کی فضا کا پطرس بخاری نے بہت عمدہ تجزیہ کیا ہے انہوں نے "جھولنے" کے دیباچے میں صوفی صاحب کی نظموں کی مجموعی فضا کو بڑے عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے۔ یہ دیباچہ اس لحاظ سے بھی قابل توجہ ہے کہ اس میں پطرس نے بچوں کے ادب کی حدود متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ یہ دیباچہ مختصر ہے اور اس سے بچوں کے ادب اور صوفی تبسم کی شاعری پر روشنی پڑتی ہے اس لئے ہم اس دیباچے کو مکمل درج کرتے ہیں:

"ایسی ہلکی پھلکی کتاب لکھنے پر جو چھوٹے چھوٹے بچوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ دیباچہ کا بوجھ نہ پڑنا چاہیئے تھا لیکن بچوں کے ساتھ قدرت نے والدین کی بھی لگا رکھی ہے۔"

صوفی تبسم، جو مصنف کتاب ہونے کے علاوہ والدین بھی ہیں اور استاد بھی یہ گوارا نہ ہوا کہ بچوں کو تو بہلایا جائے۔ اور والدین اور استادوں کی پروا نہ کی جائے اس لئے قرار پایا کہ وہ بچوں کو تو نظمیں سنائیں اور میں والدین وغیرہ کو باتوں میں لگائے رکھوں۔ بچوں کا بہلانا سہل ہے اور بڑوں کا بہلانا سہل نہیں، بچوں نے تو یہ پڑھا ہے

itsurdu.blogspot.com

چی چوں چی چوں چاچا
گھڑی پہ چوہا ناچا

اور خوش ہو لئے۔

بڑے کہیں گے کہ "چی چوں" ہم نے تو کسی لغت میں نہیں پڑھا اور یہ جو گھڑی پہ چوہا ناچا تو آخر کیوں؟ اور بہرحال اسی تک بندی کا نتیجہ کیا۔ اس سے بچوں کو کون سا سبق حاصل ہوا۔ یہ سب سوال نہایت ہی ذمہ دارانہ سوال ہیں۔ بالفاظ دیگر ان لوگوں کے سوال ہیں جو اپنا بچپن بھلا بیٹھے ہیں یا جو یہ تہیہ کئے بیٹھے ہیں کہ جن باتوں سے ان کا بچپن رنگین ہوا تھا۔ وہ اس دنیا میں اب نہ دہرائی جائیں۔ تک بندی ملانا بے فائدہ بات ہے مارنا چاہیئے۔

خدا کا شکر ہے کہ صوفی تبسم کو ایسی دانائی عطا ہوئی کہ نادانی کی لذت سے ابھی محروم نہیں ہوئے وہ جانتے ہیں کہ بچوں کا ذہن وہ عجیب و غریب دنیا ہے جس میں پیڑوں پر ناک ناچتے ہیں اور بلیاں ہیر کھاتی ہیں اور ٹرٹر چھم چھم ٹم ٹم میں آہنگ اور لے کی وہ تمام لذتیں سما جاتی ہیں جو بڑے ہو کر تان سین کی کرامات سے بھی حاصل نہیں ہوتیں۔ یہ وہ دنیا ہے جس میں گڑیاں اور جانور، پرندے اور انسان سب ایک دوسرے کے دوست ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ گویا سب مخلوق ایک ہی خدائی مخلوق ہوتی ہے۔ بڑے ہو کر ذہن انسانی ہزار فلسفیانہ کشمکش اور خیال آفرینی کے بعد بھی مشکل سے اس طرح پر پہنچتا ہے اس لئے قابل رشک ہیں صوفی تبسم ایک خوش ذوق، سخن سنج اور سخن گو ہیں۔ اردو فارسی غزل استادانہ کہتے ہیں اور جذبے اور ادا کی باریکیوں کو سمجھتے ہیں۔ یہ مجموعہ ان کی شاعری میں اتوار کا دن ہے اور یوں اتوار منانے میں انہوں نے بڑے بڑے استادوں کا تتبع کیا ہے۔ لیکن یہ سمجھیئے کہ اس دن وہ بالکل ہی خالی الذہن ہو کر بیٹھے اور جو منہ میں آئے کہہ ڈالتے ہیں۔ غور سے دیکھیئے تو معلوم ہو گا کہ تمام قافیے اور وزن اور آہنگ اور نزاکتوں پر قادر ہوئے بغیر ممکن نہ تھا۔ اس لئے صوفی تبسم کی پختہ کاری اور طباعی شواہد اس میں جا بجا نظر آئیں گے۔ ایسے کلام کا درجہ مہمل نہیں ہوتا رہا ہے کہ

صوفی تبسم کا یہ بچپن ہمیشہ قائم رہے اور ان کے قدردان ہمیشہ انہیں یہ کہنے کے قابل ہوں کہ ؎

چہل سال عمر عزیزت گذشت
مزاج تو از حال طفلی نہ گشت[1]

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے بعد بہت سے شاعروں نے بچوں کی نظموں کی طرف توجہ کی۔ ان سب شاعروں کا تفصیلی تذکرہ ہمارے موجودہ مقالے کی حدود کے اعتبار سے ضروری نہیں۔ ہم ان میں سے چھ اہم شاعروں کے نام ذیل میں درج کرتے ہیں۔ ابن انشاء ایک شاعر اور کالم نویس کے طور پر جدید اردو ادب میں بڑی شہرت رکھتے ہیں بچوں کے لئے بھی انہوں نے کئی نظمیں لکھی ہیں اور بچوں کے لئے ان کی نظموں کا مجموعہ "بلو کا بستہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

ابن انشاء نے عموماً بچوں کے کھلنڈرے پن اور خوش باشی کو نمایاں کیا ہے۔ عبدالمجید بھٹی نے بچوں کے لئے عام طور پر اخلاقی نظمیں لکھی ہیں اور ان کے مجموعے کا نام بھی "اخلاقی نظمیں" ہی ہے۔ عشرت رحمانی نے بڑی مترنم بحروں میں بچوں کے لئے نظمیں لکھی ہیں جو "ہمارے گیت" کے نام سے شائع ہوئیں۔ اسی طرح رفیق احمد خاں بچوں کے معروف شاعر ہیں اور کم و بیش ۳۵ سال سے بچوں کے لئے لکھ رہے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی نے ان کی کتاب کے دیباچے میں بچوں کی نفسیات سے ان کی واقفیت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ ان کے مجموعے کا نام "آؤ بچو گاؤ بچو" ہے جو بلاشبہ بچوں کے لئے لکھی جانے والی کتابوں میں اہمیت رکھتا ہے۔ اسی طرح خاطر غزنوی کا مجموعہ "ننھی منی" نظمیں غلام محی الدین نظر کی تصنیف "بچوں کے پھول" شیدا کاشمیری کی کتابیں "تحفہ" اور "پھول اور کلیاں" عابد نظامی کی تصنیف "میٹھے بول" بھی بہت اہم ہیں۔ اسی طرح بچوں کے لئے نیم نظر، محشر بدایونی، لطیف فاروقی، الطاف پرواز اور نظر زیدی وغیرہ

---

[1] دیباچہ "جھولنے" از پطرس بخاری

itsurdu.blogspot.com

نے بھی بچوں کے لئے بہت اچھی اور خوبصورت نظمیں لکھی ہیں ان کے علاوہ بھی بچوں کے رسائل میں اور اخبارات کے بچوں کے ایڈیشنوں میں بھی بچوں کے لئے بہت سی نظمیں شائع ہوتی رہتی ہیں اس جائزے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بچوں کے لئے نظموں کی جو روایت اردو شاعری میں شروع ہوئی تھی وہ کافی پھیل چکی ہے لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اگرچہ بچوں کے لئے بہت سی نظمیں لکھی جا چکی ہیں لیکن ایسے شاعر جنھوں نے بچوں کے لئے نظموں لکھنے کا کام مستقل اور مربوط انداز میں کیا ہو۔ بہت کم ہیں اسی طرح رسالوں اور اخبارات میں جو نظمیں شائع ہوتی رہتی ہیں ان کا فنی معیار اتنا پختہ نہیں ہوتا اور بہت سے شاعروں کو بچوں کی نفسیات سے کوئی گہری واقفیت نہیں ہوتی۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ بچوں کے لئے نظمیں لکھنے کو ایک آسان کام تصور کیا جاتا ہے۔ حالانکہ بچپن کی نفسیات کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ کام نہایت نازک اور مشکل ہے اور اس راستے پر وہی شاعر چل سکتے ہیں جو بچپن کی نفسیات سے گہری واقفیت رکھتے ہوں اور جن کے مزاج میں ڈرامائی کیفیت ہو وہ اپنی نظموں میں نئے نئے کردار سامنے لا سکیں اور دلچسپ صورت حال کو پیش کر سکیں، ان کی نظموں میں تنوع ہو اور ان کی نظموں کے آہنگ میں بچے کشش محسوس کر سکیں۔

بچوں کے لئے تفریحی ادب

حامد علی خاں

ادب بچوں کے لئے ہو یا بڑوں کے لئے اس میں تفریح کا عنصر بہرحال بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس اہمیت کو محض تفریح کے نقطہ نظر ہی سے نہیں دیکھنا چاہیئے کیونکہ تفریح ادب سے تفریح کے علاوہ ہم نہایت اہم کام بھی لے سکتے ہیں کتابوں کے ناشر اپنی اغراض کے لئے تفریحی ادب کی اہمیت کو خوب سمجھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ بازار میں سب سے زیادہ مانگ تفریحی کتابوں کی ہے۔ بچے ہوں یا بڑے، عام انسانوں کی اکثریت صرف تفریحی ادب ہی کی خریدار ہوتی ہے۔

ایک دفعہ بچوں کا ایک تفریحی رسالہ میرے دیکھنے میں آیا جس کے پہلے صفحے پر یہ لکھا تھا کہ "یہ رسالہ آٹھ سال سے لے کر اسی سال تک کی عمر کے بچوں کے لئے ہے۔"

اب دیکھئے یہ صرف ایک مزاحیہ بات نہیں ہے اس فقرے کا مصنف یقیناً فطرت انسانی کا بہت اچھا نباض ہوگا وہ جانتا تھا کہ بوڑھوں کا دل بھی دیر تک جوان ہی نہیں بلکہ بچہ بھی رہتا ہے اور اسے یہ علم بھی تھا کہ بچے تفریحی ادب سے غیر معمولی دلچسپی رکھتے ہیں۔

تفریحی ادب سے بچوں کی اس غیر معمولی دلچسپی کو پیش نظر رکھ کر ہمیں یہ سوچنا ہے کہ کیا ہم اس سے بچوں کی سیرت اور ان کی شخصیت کے ڈھالنے میں کوئی مدد لے سکتے ہیں؟ میری رائے میں تفریحی ادب، اپنی غیر معمولی مقبولیت کی وجہ سے یہ کام نہایت موثر طریقے سے انجام دے سکتا ہے۔

تفریحی ادب سے میرا مقصود محض لطیفے اور مزاحیہ مضامین نہیں ہیں اس میں وہ سب چیزیں بھی شامل ہیں جو شوق اور دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں اور جن کے پڑھنے سے لطف اٹھایا جاتا ہے یا جو اپنی ظاہری خشکی کے باوجود اس قابل بنائی جا سکتی ہیں، کہ دلچسپ معلوم ہونے لگیں۔

itsurdu.blogspot.com

بچوں کے ذہن کی مثال اس لوح کی سی ہے جو بالکل صاف ہو، جس پر کوئی نقش نہ ہو۔ ہم جس قسم کے نقش چاہیں اس پر بہ آسانی بٹھا سکتے ہیں یا یوں سمجھئے کہ بچے خام مواد کی طرح ہیں جس قالب میں چاہیئے انھیں ڈھال لیجئے، جو صورت جی میں آئے انہیں دے دیجئے۔ بچہ جس قسم کی باتیں زیادہ سنے گا، یا پڑھے گا وہ اس کے دل پر بڑوں سے کہیں زیادہ وضاحت کے ساتھ نقش ہوتی چلی جائیں گی اور یہ نقوش اس کی سیرت اور شخصیت کی تشکیل پر گہرا اثر ڈالیں گے۔

بڑوں کی طرح، بلکہ بڑوں سے بھی زیادہ بچوں کے ادب میں کہانی کی اہمیت ہے کہانی کہانی کی صورت میں ہو یا ڈرامے کی صورت میں، نظم ہو یا نثر میں، مذہبی کہانی ہو یا تاریخی یا معاشرتی واقعے پر مبنی ہو یا من گھڑت حقیقی زندگی سے تعلق رکھتی ہو یا جن پری کی خیالی زندگی سے اس کا واسطہ ہو، شیر بکری کی ہو یا چڑیے چڑیا کی ... کہانی بہرحال کہانی ہے اور یہ سب سے زیادہ پڑھی جائے گی، بہت دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔

کہانی کو اس کی اصلی اور عملی صورت میں پیش کرنے کی کوشش ہر زمانے میں ہوتی رہی ہے کیونکہ اس طرح کہانی کی دلچسپی اور اس کے اثر میں بھی بہت اضافہ ہو جاتا ہے کہانی کو ڈرامے کے قالب میں ڈھالنا اور سٹیج پر دکھانا اس کی ایک صورت تھی۔ پرانے داستان گوؤں کا ادارہ اس کی ایک دوسری صورت تھی۔ ان صورتوں میں سٹیج ایکٹر اور داستان گو کی زبان اور اس کی حرکات و سکنات کہانی کے ابلاغ کے لئے کہانی کی کتاب کا نعم البدل بن جاتی تھیں۔ موجودہ زمانے میں کتاب اور رسالے کے علاوہ ادب کے ابلاغ کا بڑا ذریعہ فلم اور ریڈیو ہے۔ پہلے زمانے میں جو لوگ کتاب پڑھنے کی ہمت نہ رکھتے تھے وہ بھی تھیٹر اور داستان گو کے توسط سے اپنے ذوق ادب کی تسکین کر لیتے تھے اور آج کل بھی جو لوگ کتابوں سے بچتے ہیں وہ فلم اور ریڈیو ڈرامے سے ضرور کم و بیش دلچسپی رکھتے ہیں۔

میں نے یہ ذکر اس لئے کیا ہے کہ کہانی کو عملی صورت میں دیکھنے کے یہ ذرائع بچوں کے لئے بہت اہمیت رکھتے ہیں اور فلم اور ریڈیو والوں کو یہ بات نہ بھولنی چاہیئے کہ ان کے ہاتھ میں ابلاغ ادب کے دو نہایت اہم ذرائع موجود ہیں ایک لحاظ سے ریڈیو کو فلم پر اس معاملے

میں فوقیت حاصل ہے کیونکہ فلم دیکھنے کے لئے گھر سے چل کر جانا پڑتا ہے مگر ریڈیو خود گھر گھر پہنچ جاتا ہے اور اپنے مفید یا مضر اثرات بڑی آسانی سے جگہ جگہ منتقل کر سکتا ہے۔

بہرحال ہماری آئندہ نسل کی سیرت اور شخصیت کی تشکیل کے کام کے لئے یہ دونوں ذرائع نہایت کارگر ہیں۔ بچوں کے رسالوں اور تفریحی ادب کی کتابوں سے بہ لحاظ تاثر یہ دونوں ذرائع آگے ہیں اور اگر یہ دونوں ذرائع آئندہ نسل کے متعلق اپنے قومی فرض کا صحیح احساس کر لیں تو نہ صرف بچوں ہی کی، بلکہ بچوں اور بڑوں کے لئے لکھنے والے مصنفین کی بھی راہنمائی کر سکتے ہیں۔

سیرت کی تشکیل سے شخصیت کی تشکیل خود بخود ہو جاتی ہے جتنی عمدہ سیرت ہوگی اتنی ہی عمدہ شخصیت اس سیرت سے صورت پذیر ہوگی۔ کمزور سیرت سے کمزور شخصیت اور مضبوط سیرت سے مضبوط شخصیت بنتی ہے۔

سیرت کی تشکیل اور اصلاح کا کام عام طور سے "اخلاقی" کتابوں کا کام سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اخلاقی کتابیں یہ کام زیادہ موثر طور پر نہیں کر سکتیں۔ خالص اخلاقی کتاب سے تو ہزاروں میں سے کسی ایک شخص کو لگاؤ ہوتا ہے جس کتاب میں صرف نصیحتیں لکھی ہوں لوگوں کو علی العموم اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اگر بچوں کے نصاب تعلیم میں کسی خالص اخلاقی کتاب کو شامل کر دیا جائے اور اس طرح بچے اسے پڑھنے پر مجبور ہو جائیں تو بھی وہ اسے خشک سبق سے زیادہ اہمیت نہ دیں گے اور جب جی لگا کر نہ پڑھیں گے تو ظاہر ہے کہ اس کا کوئی اثر بھی نہ ہوگا انہیں یہ محسوس ہوگا کہ یہ نصیحتیں جبراً ان پر ٹھونسی جا رہی ہیں اور انسانی فطرت چونکہ جبر سے ہمیشہ ابا کرتی ہے اس لئے عموماً وہ ان نصیحتوں پر کان نہ دھریں گے لیکن یہی باتیں اگر سلیقے سے ساتھ بچوں کے تفریحی ادب میں سمو دی جائیں یعنی نصیحت کی کڑوی گولی، کہانی، لطیفے وغیرہ کی شکر کے غلاف میں لپیٹ دی جائے تو مٹھائی اور دوا میں تمیز نہ ہو سکے گی۔ بچے بے مزہ بھی نہ ہوں گے اور دوا بھی اپنا کام کر جائیگی۔

بعض لوگ بچوں کے لئے کہانی لکھ کر اس کے بعد اس سبق کا ذکر کرتے ہیں جو اس کہانی سے حاصل ہوتا۔ یہ طریقہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ بچے اس قسم کی کہانی کو ایسا جال سمجھنے لگتے

itsurdu.blogspot.com

ہیں جن میں انھیں جیلہ گری سے پھنسانے کی کوشش کی گئی ہو۔ چنانچہ ایسی کہانی اپنی دلچسپی کو بہت کچھ کھو بیٹھتی ہے اگر پہلے ایسی کہانی کو پڑھ بھی لیں تو بعد میں لکھے ہوئے سبق کو یا تو سرے سے چھوڑ ہی دیتے ہیں یا بے توجہی سے پڑھتے ہیں اور اس کا اثر کم ہی قبول کرتے ہیں ہمیں اس باب میں یاد رکھنا چاہیے کہ

ع برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی ست

مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ پہلے زمانے میں بھی بڑے بڑے زبردست معلمین اخلاق نے اپنی کہانیوں کے آخر میں کہانی کے سبق کا ذکر کیا ہے لیکن شاید یہ خیال بھی غلط نہیں کہ پھر ان کی کہانیاں تفریح اور دلچسپی کے لحاظ سے بلند پایہ ہونے کے باوجود زیادہ تر اخلاقی درس ہی سمجھی گئی ہیں۔

حکایات لقمان دنیا بھر کے ادب میں اپنے رنگ کی بے مثال کہانیاں ہیں ان میں سے ہر کہانی کے آخر میں اس سبق کا ذکر ہے جو کہانی سے حاصل ہوتا ہے ہم تک یہ کہانیاں روایت در روایت بدل کر تراجم کی صورت میں پہنچی ہیں۔ اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ ابتدا ہی میں کہانی کے آخر میں یہ سبق موجود تھے یا بعد میں ان کا اضافہ کیا گیا۔ ممکن ہے یہ ابتداء میں بھی موجود ہوں لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ تفریحی ادب سے جو کام ہم لینا چاہتے ہیں اسے ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے یہ طریق کار مفید ہونے کے بجائے مضر ہوگا۔

شیخ سعدیؒ نے کہانی کے بعد نصیحت کی تلخی کو کم کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ وہ کہانی کے بعد اس کے سبق کو نثر کے بجائے اشعار کی صورت میں درج کر دیتے تھے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ سعدیؒ کو احساس تھا کہ کہانی کی تفریحی حیثیت کو سبق کا صاف صاف ذکر نقصان پہنچاتا ہے۔ انہوں نے اس نقصان کی تلافی شعر کی چاشنی سے کی۔

خود حکایات لقمان میں بعض اوقات سبق اس طریقے سے درج کیا گیا ہے جس میں کسی قدر اس کے اخفا کی کوشش ظاہر ہوتی ہے مگر بہترین طریق کار یہی ہے کہ سبق کہانی کے اندر ہی سمو دیا جائے مثلاً:

The dog in the manger یا "چرنی میں کتا" لقمان کی ایک مشہور

کہانی ہے:

ایک بیل کی چرنی میں گھاس کا انبار لگا تھا اس پر آ کر کوئی کتا بیٹھ گیا۔ بھوکا بیل اپنے کام سے چھٹی پا کر جب گھاس کھانے کے لئے آیا تو کتا بھونکنے لگا۔ بیل نے لاکھ سمجھایا کہ بھئی گھاس تمہارے کام کی چیز نہیں میں بھوکا ہوں مجھے کھا لینے دو، مگر کتے نے ایک نہ مانی، بار بار بھونکتا اور یہی کہتا نہ کھاؤں گا، نہ کھانے دوں گا! آخر بیل بیچارا یہ کہہ کر ایک طرف پڑ رہا کہ "تم بہت بدطینت اور کمینے ہو کہ جو چیز تمہارے کام کی نہیں اس سے بھی کسی دوسرے کو فائدہ اٹھانے نہیں دیتے"۔

اس طرح یہ خوبی نصیحت گویا کہانی کے اندر ہی سمو دی گئی ہے کیونکہ بیل کا یہ جواب کہانی کا ایک جزو معلوم ہوتا ہے، کوئی الگ اخلاقی سبق معلوم نہیں ہوتا۔

اگر لقمان کے اس طریق کار کی تقلید کی جائے اس کو مزید نشوونما دے کر کہانی کے تفریحی عنصر کو بہ ظاہر اس کے "مقصدی" عنصر پر غالب رکھا جائے تو بچوں کو کہانی زیادہ دلچسپ معلوم ہوگی اور وہ اسے تفریحی کہانی سمجھ کر بڑے شوق سے پڑھیں گے۔ اس طرح وہ مقصد بھی جو ہم نے بڑے سلیقے سے کہانی کے اندر سمویا ہوگا۔ زیادہ موثر طریقے سے پورا ہو جائے گا۔

ہماری نئی نسل کے لئے پرانا تفریحی ادب ہر طرح کفایت نہیں کرتا۔ بعض پرانی اقدار بدل چکی ہیں۔ ہماری خاص قومی ضروریات مختلف ہیں۔ ہمیں ان کا لحاظ بھی رکھنا ہے اور عام انسانی اوصاف کے لحاظ سے بھی ہمیں پاکستان کی نئی پود کو بہتر بنانا ہے۔ ہمیں محب وطن، بہادر، اولوالعزم تنظیم پسند، جمہور دوست حق پرست امین اور خود دار نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ ان میں جہاں گرد سیاح بھی ہونے چاہئیں اور ایسے لوگ بھی جو علم و حکمت کی تلاش میں مشرق و مغرب کے سرے آپس میں ملا دیں۔

اگر ہمارا تفریحی ادب لکھنے اور پھیلانے والے افراد اور ادارے، مصنف، ناشر

itsurdu.blogspot.com

فلم کار، ریڈیو اور تفریحی رسائل ان مقاصد کو پیش نظر رکھ کر نیا تفریحی ادب پیدا کریں۔ اور مناسب طریق سے ان اہم مقاصد کی تبلیغ کا فرض انجام دیں۔ تو چند ہی سال میں ہماری مشکلات حل ہو سکتی ہیں۔ اگر ہم تاریخ، سوانح عمری اور سفرنامے وغیرہ کے بھی دلچسپ اور تفریحی عنصر کو الگ کر کے اس سے یہ مفید کام لینے کی کوشش کریں تو اپنے قومی اور اسلامی ادب کے علاوہ دنیا بھر کے اعلیٰ ادب سے بھی ہمیں ایسا بہت سا مواد حاصل ہو سکتا ہے جس کا مطالعہ طبیعتوں پر بوجھ ڈالنے کے بجائے تفریح کا ذریعہ بھی ہو اور اسلامی و تعمیر قوم کا ذریعہ بھی بن جائے۔

آخر میں ایک دفعہ پھر میں یہ دہرا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس تعمیری کام کے لئے ادب کے ابلاغ کے جن ذرائع کا میں نے ذکر کیا ہے وہ اسی صورت میں یہ کار اہم خوبی اور کامیابی سے انجام دے سکتے ہیں کہ وہ یہ بات ملحوظ رکھیں کہ جن اصناف ادب سے انھیں کام لینا ہے ان میں سے کسی صنف کے تفریحی عنصر پر اس کا مقصدی عنصر غالب نظر نہ آنے پائے۔

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان)

بچوں کا جاسوسی ادب

ذوالفقار احمد تابش

والدین، اساتذہ، ادیبوں اور دانش وروں میں ایک موضوع ان دنوں زیر بحث ہے جس پر بہت لے دے ہو رہی ہے۔ زیر بحث بات یہ ہے کہ کیا بچوں کو جاسوسی ادب پڑھنا چاہیے؟ اس کے حق اور مخالفت میں دونوں فریقین کے پاس دلائل ہیں۔ لیکن آگے بڑھنے سے پہلے چند وضاحتیں پیش کر دوں تو موضوع اور اس کا پس منظر زیادہ واضح ہو جائیں گے۔

اب سے صرف ۷/۸ سال پہلے ہمارے ملک میں بچوں کے لئے جاسوسی ادب کا کوئی نام تک نہ جانتا تھا اور بچے اس نئی وبا سے مکمل طور پر محفوظ و مامون تھے۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ان چند برسوں میں صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ کوئی بچہ اس آفت سے محفوظ نہیں رہا۔ جاسوسی ناولوں نے پوری نسل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اور لڑکیاں اور لڑکے اپنے بستوں میں اسکول کی کتابوں کے ساتھ ساتھ دو چار جاسوسی ناول بھی ضرور رکھتے تھے۔ اپنا سارا جیب خرچ ان کتابوں پر خرچ کر دیتے ہیں جو کتابیں خرید نہیں سکتے وہ دوستوں سے مانگ کر پڑھتے ہیں یا محلہ لائبریریوں سے کرائے پر حاصل کر کے پڑھتے ہیں۔

پس منظر اس کا یہ ہے کہ لاہور کے ایک اشاعتی ادارے نے کچھ سال پہلے ابن صفی (مرحوم) کے طرز پر بچوں کے لئے سراغ رسانی اور جاسوسی ناول شائع کرنے کا تجربہ کیا۔ یہ ان کے دیگر کئی تجربوں مثلاً بچوں کے لئے ایک ایک روپے والی کتابوں، منی کتابوں یعنی ۲۵ پیسے اور ۵۰ پیسے والی کتابوں، پُر اسرار اور مافوق الفطرت کرداروں پر مشتمل ناولوں کی اشاعت جیسے تجربوں سے ایک تجربہ تھا۔ یہ سارے تجربے ہی تقریباً کامیاب رہے۔ اور اس ادارے نے ان سلسلوں کی کتابوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ ان میں ایک سلسلہ ایسا تھا جو پر اسرار اور مافوق الفطرت کرداروں پر مشتمل ایک کہانی تھی۔ اور شاید سو یا اس سے بھی زائد جلدوں تک پھیلی ہوئی تھی (شنید ہے کہ ان کی تعداد اب دو سو پر محیط ہونے والی ہے) ۵۰ پیسے اور ایک روپے

itsurdu.blogspot.com

والی منی کتابوں کے سلسلے بھی بچوں میں بہت مقبول ہوتے۔ لیکن چند برسوں میں کاغذ اور طباعتی اخراجات میں بے پناہ اضافے کے باعث یہ سلسلے اب بند ہو گئے کہ اس قیمت پر ان کی اشاعت اور فروخت ممکن نہیں رہی تھی۔

لیکن ان تمام سلسلوں میں "ہٹ" سلسلہ جاسوسی ناولوں کا ثابت ہوا جس نے بچوں میں بے مثال مقبولیت حاصل کی۔ اس سلسلے کی کامیابی اور بچوں میں اس کی مقبولیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب لاہور، کراچی اور بعض دوسرے شہروں میں متعدد ادارے اسی وضع کے ناول چھاپ اور بیچ رہے ہیں ـــــ اور بچے ان ناولوں کے دیوانے ہو رہے ہیں ـــــ یہ ناول ابن صفی کے ناولوں کا نہایت ہی بھدا چربہ ہوتے ہیں۔ زبان و بیان غلط اور ناقص ایک ہی وضع کی کہانیوں یا پلاٹ کی تکرار ـــــ بے جوڑ، غیر مربوط، غیر منطقی واقعات و حادثات ـــــ بچوں کی عمروں اور ان کے اذہان سے غیر مطابق پلاٹ اور بیان۔ غیر فطری اور غیر سائنسی واقعات پر مشتمل کہانیاں، بے تکی اور مضحکہ خیز بچے کو ان سے کوئی اخلاقی سبق نہیں ملتا۔ اس کی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اسی لئے ہر ناول میں ایک مجرم ہوتا ہے جسے چند بچے اور پولیس آفیسر مل کر آخر میں پکڑ لیتے ہیں۔ لیکن اس غیر حقیقی اور شعبدہ بازی کے انداز میں آپ پڑھیں تو پریشان ہو جائیں کہ یہ سب کچھ کیسے ممکن ہے۔

پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا بچوں کو جاسوسی ناول نہیں پڑھنے چاہئیں اور کیا یہ ان کے لئے مضر ہے؟

یہ سوال جتنا آسان اور مختصر ہے اس کا جواب اتنا ہی طویل اور پیچیدہ ہے۔ دنیا بھر میں اس سوال پر بحث ہوتی آئی ہے اور ہوتی رہتی ہے لیکن ابھی تک اس میں کوئی اصول قائم نہیں ہو سکا۔

بات یہ ہے کہ بچوں کے لئے جاسوسی ادب ہمارے ہاں نیا نیا متعارف ہوا ہے لیکن دنیا کے دوسرے ملکوں میں اس وضع کا ادب عرصہ دراز سے لکھا اور پڑھا جا رہا ہے۔ وہاں بھی والدین اساتذہ اور لکھنے والوں میں اس پر بحث ہوتی رہتی ہے لیکن وہاں بھی بچے ذوق و شوق سے جاسوسی کتابیں پڑھتے ہیں اور اختلاف کے باوجود وہاں جاسوسی ادب کو تو نہ روکا جا سکا ہے

اور نہ اس پر کوئی قدغن لگائی جا سکی ہے۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ اپنے ہاں ایسے ادب کی اشاعت کسی طرح بند کی جائے تو یہ ممکن نہ ہو گا۔

ایسے بہت سے والدین اور اساتذہ ہیں جو ایسے ادب کو بچوں کے لئے مضر قرار دیتے ہیں، بہت سے ایسے دانشور ہیں جو بچوں کے لئے اس قسم کے ادب کا مطالعہ بے فائدہ سمجھتے ہیں۔ جبکہ اس کے مقابلہ میں ایک بڑی تعداد ایسے حضرات کی بھی ہے جو بچوں پر کسی قسم کی بھی کتب کے مطالعہ کے ضمن میں پابندی لگانے کے سخت خلاف ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ بچوں کو ہر قسم کی کتابوں کا مطالعہ کر کے اچھی اور بری کتابوں میں امتیاز کرنے کی تمیز خود پیدا کرنی چاہیئے۔

اس سلسلے میں میری رائے یہ ہے کہ جاسوسی ادب کو میں بچوں کے لئے ممنوع قرار دینے کے حق میں تو نہیں ہوں کہ اس کا کوئی افادی پہلو ہو یا نہ ہو اس کا ایک تفریحی پہلو ضرور ہے جو اپنی جگہ کچھ کم فائدہ مند نہیں۔ خاص طور پر اس صورت حال میں کہ بچوں کے لئے ہمارے ہاں تفریح کے ذرائع کیا ہیں؟ اور کتنے ہیں، اور دوسرے یہ کہ انہیں متبادل تفریح کا ذریعہ آپ کیا تجویز کریں گے؟ فلم، ٹی وی، وی سی آر؟ لہٰذا اس وضع کی کتابیں اگر دوسرے ملکوں کے بچے پڑھ رہے ہیں تو یہاں بھی انہیں تفریح کے لئے پڑھنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دوسرے ملکوں میں چھپنے والا اس قسم کا ادب اس طرح بے راہرو اور بے مہار نہیں ہے جس طرح کہ ہمارے ہاں ہے بلکہ آغاز ہی میں یہ بے لگام ہو گیا ہے مثلاً میں مثال دیتا ہوں۔

انگریزی میں ایک بچوں کی ایک خاتون ادیب ہے جنکا نام "اینڈ بلائٹن" (ENID BLYTON) ہے یہ خاتون بچوں میں بے حد مقبول اور معروف ہے۔ اس نے بلا مبالغہ صدہا کتابیں بچوں کے لئے لکھی ہیں جن میں ہر وضع کی کتابیں ہیں حتیٰ کہ جاسوسی ناول بھی ہیں۔ لیکن بچوں کے یہ جاسوسی ناول بچوں کے ذہن، عمر، نفسیات اور ذخیرہ الفاظ کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں ان ناولوں کی ایک کثیر تعداد ایسی ہے جس میں چند بچے کسی تفریحی سفر یا مہم کے دوران ایسے واقعات سے دوچار ہوتے ہیں جو جاسوسی رخ اختیار کر لیتے ہیں اور وہ بچے کسی مجرم یا مجرموں کے گروہ کی گرفتاری کے موجب بن جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض ناول ایسے بھی ہیں

itsurdu.blogspot.com

جو ڈھائی تین سو صفحات پر محیط ہوتے ہیں۔ لیکن انہیں آپ پڑھ کر دیکھیں تو آپ محسوس کریں گے کہ کہیں بھی بچوں کے قد و قامت کو کھینچ کر لمبا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

بچوں کی ساری سرگرمیاں اور اعمال و افعال بچوں ہی کے معلوم ہوتے ہیں۔ کہانی اپنے فطری بہاؤ کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ مصنف شعبدے بازی نہیں کرتی رہتی۔ نہ ہی ان بچوں کو سپرمین بنانے کی کوشش کرتی ہے۔ چنانچہ اینڈ بلائٹن کے ناول بچوں میں اپنی ان خصوصیات کی بنا پر بے حد مقبول و معروف ہیں اور لوگ ان کے مطالعے پر معترض نہیں ہوتے۔ لیکن اپنے ہاں صورت بالکل برعکس ہے ان ناولوں کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ زبان و بیان سے لے کر پلاٹ اور ٹریٹمنٹ تک۔ بچے لگتا ہی نہیں کہ بچے ہیں جادوگر یا شعبدہ باز لگتے ہیں۔ لہٰذا سارا ڈھانچہ ہی غیر فطری غیر حقیقی اور مضحکہ خیز بن جاتا ہے۔

میں نے عرض کیا نا کہ یہ ناول الف سے یے تک ابن صفی کے ناولوں کا بھدا چربہ ہوتے ہیں میں ان ناولوں کے مطالعے کے حق میں ہرگز نہیں ہوں۔ بلکہ ان کو بچوں کے لئے مضر سمجھتا ہوں۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر میں ان ناولوں کو مضر سمجھتا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا ہوں کہ ان پر پابندی نہ تو عاید کی جا سکتی ہے اور نہ اس دباؤ کہ کسی قانونی ضابطے سے روکا جا سکتا ہے۔ تو علاج کیا ہے؟ جبکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بچوں میں آج کل صرف اسی وجہ کی کتابیں مقبول ہیں ــــ میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ ہمارے بچے ان ناولوں کے شیدائی اس لئے ہیں کہ ان کے پاس مطالعے کے لئے اور کوئی مواد سرے سے موجود ہی نہیں۔ ہمارے ملک میں بچوں کی اچھی کتابوں کا ایسا قحط ہے کہ اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ آپ جیب میں صرف ۵۰۰ روپے ڈال کر چل پڑیں اور لاہور کی سب سے اچھی بک شاپ پر چلے جائیں تو آپ یہ رقم بچوں کی اچھی کتابوں کی خرید پر ساری خرچ نہیں کر سکیں گے۔ ناممکن ہے ایسی کتابیں جو بچوں کو صحت مند تفریح دے سکیں، ایسی کتابیں جو بچوں کو اپنے ملک، قوم، مشاہیر، تاریخ، عہد موجود کی سائنسی ایجادات، اکتشافات، اس کے ماحول اردگرد اور واقعات کے بارے میں کچھ بتا سکیں۔ اتنی ہیں کہ آپ ڈیڑھ دو سو روپے میں ساری خرید کر لے آئیں گے اور اس کے بعد

آپ بے بس ہو جائیں گے۔ آپ یا تو غیر ملکی انگریزی کتابیں خریدیں یا پھر بچوں کے لئے جاسوسی، پُراسرار، مافوق الفطرت کرداروں پر مشتمل ناول خریدیں۔ ظاہر ہے آپ یہ زہر بچوں کو خرید کر نہیں دے گے۔

کیفیت یہ ہے کہ آج کا بچہ میرے اور آپ کے بچپن کے زمانے سے مختلف ذہن، اپروچ اور منطقی مزاج رکھنے والا بچہ ہے وہ ذرائع ابلاغ کی بے پناہ یلغار کی زد میں ہے طرح طرح کے رسائل، رنگ برنگے اخبار، جریدے، ریڈیو، کیسٹ، ٹیلی ویژن، وی سی آر، کمپیوٹر، سب کچھ اس کے اردگرد ہے اور وہ ان سے اچھی طرح متعارف ہے۔ ان ذرائع ابلاغ نے اس کے ذہن کو ایک طرف تو عمر سے بہت پہلے بلوغت دی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے بھونچکا بھی کر دیا ہے۔ چنانچہ ایسے بچوں کی نسل کے لئے جو لٹریچر ہمیں لکھنا، چھاپنا اور شائع کرنا چاہیئے اس میں ان سب تقاضوں، حقائق ان کے تجزیے کے ساتھ ساتھ اس کی تربیتی ضروریات کو بھی دھیان میں رکھنا ضروری ہے۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ ہمارے پاس بچوں کو دینے کے لئے کوئی لٹریچر ہے ہی نہیں ہم انہیں کیا پیش کریں۔ اس وقت آپ اور میں انہیں یہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں کہ "بیٹا! یہ نہ پڑھو دیکھو یہ کتابیں پڑھو یہ زیادہ اچھی ہیں"۔ چنانچہ اس صورت حال میں جو انہیں مل رہا ہے وہ پڑھے جا رہے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ سب کچھ بے معنی اور بے مطلب ہے اب ہم انہیں روکیں تو کس طرح؟ اس کے لئے ہمیں ان کے لئے مطالعاتی مواد تیار کرنا ہوگا جو ہمارے پاس نہیں ہے نہ صرف نہیں ہے بلکہ تا حال اس کی نہ تو کوئی پلاننگ ہے۔ نہ پروگرام، ایسا پروگرام کہ سارے ملک کے بچوں کو ان کی ضروریات کے مطابق مطالعاتی مواد فراہم کیا جا سکے۔

(بشکریہ: روزنامہ امروز)

itsurdu.blogspot.com

پریوں کی کہانیوں سے خوف کیوں؟

ڈاکٹر سہیل احمد خاں

جب سے کبھی کوئی سرکاری ادارہ بچوں کے لئے کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ بناتا ہے یا کسی ادبی اجتماع میں بچوں کے ادب کے بارے میں بحث ہوتی ہے تو ایک مسئلہ بالعموم سامنے آتا ہے کہ بچوں کے لئے پریوں کی کہانیوں کا کیا جواز ہے کچھ یوں اندازہ ہوتا ہے کہ سرکاری ادارے بالخصوص پریوں کی کہانیوں سے خائف ہیں۔ اعتراض کے لئے موجودہ دور کے بعض بنے بنائے کلیئے بار بار دہرائے جاتے ہیں۔

سائنسی زمانہ صنعتی دور حقیقت پسندی ان الفاظ کی تکرار سے ایک جذباتی فضا پیدا کر کے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے۔ کہ موجودہ زمانے میں بچوں کے لئے پریوں کی کہانیوں کی بجائے نئی ایجادات، سائنس اور سائنس دانوں کے بارے میں معلومات فراہم کرنا زیادہ مفید ہے میں نے سائنس دانوں کی سوانح عمریاں اتنی نہیں پڑھیں کہ بتا سکوں کہ کون کونسا سائنسدان بچپن میں کیا پڑھتا تھا۔ لیکن اتنی بات تو طے ہے کہ اگر یہ سائنس دان کبھی بچے تھے تو خود انہوں نے بھی پریوں کی کہانیاں سنی ہوں گی یا پڑھی ہوں گی۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ آیئے یہ دیکھیں کہ پریوں کی کہانیوں سے خوف کے کیا معنی ہیں۔ ان کہانیوں سے خائف لوگوں کے ذہن میں حقیقت پسندی کے نام پر ایک بنا بنایا سانچہ ہے جس میں وہ بچوں کو مقید کرنا چاہتے ہیں۔ یہ دیکھے بغیر کہ بچے کا جو تصور ان کے ذہن میں ہے وہ بچپن کی نفسیات سے کتنا مختلف ہے۔ دراصل یہ دو رویے اس چیز کی بنیاد پر علیحدہ ہیں کہ پریوں کی کہانیوں کی مخالفت کرنے والے بچوں کے لئے معلومات کو اہم سمجھتے ہیں۔ جبکہ پریوں کی کہانیاں معلومات فراہم کرنے کی بجائے تخیل کی امکانی دنیاؤں کو سامنے لاتی ہیں۔

پہلا تصور مشینی ہے جس میں بچوں کو کمپیوٹر کی طرح کی کوئی چیز فرض کر لیا جاتا ہے جس کے ردعمل رویے اور جذبات پہلے سے فراہم کئے گئے۔ بعض اعداد و شمار کے تابع ہیں دوسرا

تصور فطری ہے کہ اس میں نت نئی امکانی صورتیں سامنے آ کر آہستہ آہستہ ذہن میں کائنات کے ساتھ ایک یگانگت پیدا کرتی ہیں۔ کائنات کے ساتھ ایک زندہ تعلق قائم ہو جاتا ہے پریوں کی کہانیوں سے خوف کے معنی ہیں تخیل اور جذبہ کی رنگا رنگی اور انسانی صلاحیتوں کی امکانی صورتوں کا خوف ان دیکھی زمینیں، پھولوں اور موتیوں سے بھرے ہوئے جزیرے اڑتے ہوئے تخت، بولتے ہوئے درخت، انسانی صفات کے حامل جانور دیو اور پریاں جس کائنات کی تصویر تیار کرتے ہیں اس میں کائنات کے مختلف طبقوں اور مخلوقات کے مختلف درجوں کو ایک عظیم وحدت کا درجہ سمجھا جاتا ہے۔ وجود کے مختلف درجوں کی یہ وحدت کائنات کو ایک ایسی مقدس چیز بنا دیتی ہے جس کا ذرہ ذرہ تخلیق کے اس ہمہ گیر نظام میں اپنا مقررہ فعل ادا کر رہا ہے۔

پریوں کی کہانی سے خوف ایک سطح پر خود انسانی بچپن سے خوف بھی ہے کیونکہ بچپن معصومیت، امکانات اور مستقبل کی علامت ہے ہم میں سے وہ لوگ جو اپنی معصومیت اور اپنے امکانات کو کم کر چکے ہیں بچوں میں اسی معصومیت اور ان امکانات کو دیکھ کر چڑ جاتے ہیں۔ اور بچوں کو اپنے جیسا دنیا دار بنانے کے لئے طرح طرح کی تاویلیں کرنے لگتے ہیں۔ ہم بچوں میں اپنی مکاری اور چالاکی دیکھنا چاہتے ہیں اور بچپن کو اس لئے پسند نہیں کرتے کہ خود بچپن سے دور نکل آتے ہیں۔ اور سوٹ پہن کر بڑی بڑی میٹنگوں میں جاتے ہیں۔ بچپن ہمیں لاپرواہ، غیر ذمہ دار اور غیر سنجیدہ دکھائی دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ بچوں کے پاس بھی ہمارے جیسی معلومات ہوں۔ ان معلومات کی افادیت سے انکار نہیں۔ لیکن کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم انسانی زندگی سے بچپن ہی کو نکالنے کی سعی کر رہے ہوں۔ حضرت ابن العربیؒ نے اپنی کتاب "فصوص الحکم" کی فص موسوی میں بچے کی روحانی معصومیت کے بارے میں لکھا ہے:

"کیا تم فرعونوں کو نہیں دیکھتے کہ ان کے فعل کا بڑوں میں بالخاصہ اثر ہوتا ہے اور بڑا آدمی بچے کی محبت سے اپنی ریاست کی شان سے باہر کام کرتا ہے اور بچہ اس کی ریاست اور منزلت سے اپنی طرف اتار لیتا ہے پھر اس سے وہ بڑا آدمی کھیلتا ہے اور اس کو لے کر وہ ناچنے لگتا ہے

itsurdu.blogspot.com

پھر اس سے ایسی باتیں کرنے لگتا ہے جو اپنے کو اس کے نزدیک اسی کا عقل کا ظاہر کرتی ہے بس وہ بچے کی تسخیر میں ہے لیکن اس کو یہ خبر نہیں کہ یہ میری تسخیر کر رہا ہے اور وہ بچہ بڑے آدمی کو اپنی تربیت اور حفاظت میں مشغول کر لیتا ہے تاکہ وہ تنگ دل نہ ہو پس یہ سب بچوں کا اثر اور فعل بڑوں میں ہے اور یہ سب اس کی قدر و منزلت کے سبب سے ہے اس لئے کہ بچے کو خدا کے ساتھ یہ نیا نیا زمانہ ہے۔ کیونکہ اس کی تکوین نئی ہے اور بڑوں کو بہت بعد ہو گیا ہے۔"

اس اقتباس سے اگر آپ کو ورڈز ورتھ یاد آئے تو کوئی حرج نہیں لیکن یہ فرق ضرور ملحوظ رکھئے کہ ورڈز ورتھ کا نقطہ نظر محض جذباتی ہے اور شیخ اکبر روحانی اور مابعد الطبیعاتی نقطہ نظر سے دیکھ رہے ہیں اسی لئے تو حدیث شریف میں کہا گیا ہے کہ ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔

شیخ اکبر کے نقطہ نظر سے بچے کا روحانی مرتبہ اس لئے زیادہ ہے کہ خدا کے ساتھ اسے نیا نیا زمانہ ہے۔ کہیں بچے اور بچپن کو اپنے محدود سانچوں میں اتارنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم ہر اس چیز سے ڈرتے ہیں جو خدا کے قریب ہے یعنی ہر وہ چیز جو ہماری مکاری کو ہم پر آشکار کرتی ہے جو ہمارے فریبوں کو آئینہ دکھاتی ہیں۔ جو اس پاکیزگی کو پھر سے ہمارے سامنے لے آتی ہے۔ جسے ہم بھول چکے ہیں۔

پریوں کی کہانیاں بچوں کے لئے ایک سطح پر حقیقت ہیں۔ لیکن ان کی کئی علامتی سطحیں بھی ہیں۔ آج جو ایجادات کا شہرہ ہے پریوں کی کہانیاں اس طرح کی چیزوں بلکہ ان سے کہیں آگے کی چیزوں کا صدیوں سے تذکرہ کرتی آئی ہیں۔ اس استدلال کو پریوں کی کہانیوں کے حق میں بولنے والے عموماً استعمال کرتے آئے ہیں لیکن وہ اس حقیقت کو فراموش کر جاتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنے مخالفین کے نقطہ نظر ہی کی ایک توسیع بن رہے ہیں۔ اگر کل پریوں کی کہانیاں ان ایجادات کا تذکرہ کرتی تھیں تو آج سائنس نے ان کو عملی شکل دے دی ہے اور جو چیزیں آگے کی ہیں کل کے سائنس دان باقی چیزوں کو بھی عملی شکل میں سامنے لے آئیں گے۔

یہ نقطہ نظر پرانی کہانیوں کو پوری طرح نہ سمجھ پانے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ پرانی کہانیاں تسخیر کائنات کا ذکر ہی نہیں کرتی۔ علامتی طور پر تسخیر کا یہ عمل خارج اور باطن دونوں سطحوں سے پیوست ہے اور تسخیر باطن کا درجہ باقی سطحوں سے بڑا ہے پرانی کہانیاں یہ کہتی ہیں کہ تسخیر باطن یعنی اپنے نفس کی تہذیب کے بغیر تسخیر فطرت یا تسخیر کائنات ایک ادھورا فعل ہے۔ جدید شعور تسخیر فطرت کے اصول کو اہمیت دیتا ہے لیکن تہذیب نفس اور تسخیر باطن کے اصول کو بھول چکا ہے جس کے نتیجے میں فطرت اور انسان انفس اور آفاق میں ایسی ہوش ربا دوری پیدا ہو چکی ہے جس نے جدید انسان کو ذہنی انتشار میں مبتلا کر رکھا ہے اس وقت مغرب کا ادب اور مغربی علوم اسی دلدل سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، یہی وہ مرکزی سچائی ہے جو آپ کو سائنسی معلومات کی کتابوں میں نہیں ملے گی۔

پریوں کی کہانیوں کا خوف کھانے والے تنگ نظر عقل پرست اگر ان پرانی کہانیوں کو سمجھنے کی کوشش کریں تو وہ فطرت معصومیت تخیل اور سب سے بڑھ کر تہذیب نفس کے اصول کو سمجھ سکیں گے جس کے بغیر تسخیر کائنات بھی ایٹمی جنگ کی تیاریوں کے مرحلے سے زیادہ نہیں۔

---

itsurdu.blogspot.com

ریڈیو اور ٹیلیوژن کا ادب

خالد غزنوی

کچھ زیادہ مدت کی بات نہیں جب ہمارے ہاں بچوں کی تفریح کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ بچوں کی تفریح غیر منظم تھی۔ سال کے سال عید، شب برات پر نئے کپڑے یا میلوں ٹھیلوں میں جھولوں، ہنڈولوں سے بچے لطف اندوز ہوتے تھے۔ والدین کا رویہ دوستانہ کم اور تحکمانہ زیادہ ہوتا تھا۔ کبھی کبھار والد کے کوئی ملنے کھ دوست گھر آجاتے تو ان کی دلچسپ باتیں، سفر کے حالات بے ضرر مذاق بچوں کو تفریح بخش دیتے یا پھر شہر ہی کسی تھیٹر منڈلی کے آجانے سے بچے والدین سے چھپ چھپا کر منڈوے میں پہنچ جاتے (یہ بات کرتے ہوئے میرے ذہن میں ریڈیو نے بخاری اور پطرس بخاری کا پہلی مرتبہ والد سے چھپ کر تھیٹر جانے کا واقعہ محفوظ ہے جسے ریڈیو نے بخاری نے اپنی سوانح کی کتاب سرگزشت میں لکھا ہے) پھر بچپن میں دادی یا نانی اماں کی کہانی کی لذتیں ہر بچے کو شام کی آمد کا انتظار کرنے پر مجبور کرتی تھیں باقاعدہ طور پر تفریح کا سامان بچوں کے علاقائی کھیل ہوتے تھے اور ان کھیلوں کا مرکز شہر اور دیہات کی گلیاں، میدان اور میدانیاں تھیں یہ مقامات بچوں کے شور شرابے، قہقہوں، رونے اور توڑ پھوڑ کے کئی اثرات سے آباد رہتے۔

پہلے پہل بچوں کو تفریح بہم پہنچانے والے پروگراموں اور تفریح میں حصہ لینے کا باقاعدہ موقعہ بیڈن پاول کی سکاؤٹ تحریک کی وساطت سے ملا۔ پھر سکولوں میں ڈرامے سٹیج کئے جانے لگے، کتابیں چھپنے لگیں تو کہانی اور نظم کے ساتھ تقریروں نے بھی بچوں کو لبھایا۔ ملک میں ریڈیو کی نشریات میں بچوں کو حصہ ملا اور اب ٹیلی وژن کی نشریات نے زیادہ سے زیادہ بچوں کو اپنی میں چپک کر سکرین کے سامنے بیٹھنے کا موقعہ بخشا ہے اب اپنے ہی بہن کو پروگرام پیش کرتے دیکھ کر بچوں میں خود بھی پروگراموں میں حصہ لینے کی خواہش جاگ اٹھی ہے اب ماؤں نے جیسے

کے جیسے اپنے ننھے منوں کو نہلا دھلا، نئے کپڑے پہنا کر ریڈیو اور ٹی وی پروگراموں میں بھیجنا شروع کر دیا ہے۔ بچوں کو رخصت کر کے خود وہ اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر بچوں کے پروگرام کی نشریات پر آنکھیں مرکوز کر کے اپنے بچے کو تلاش کرنے کی زحمت اور بچے کی آواز سن کر تسکین کی لذت حاصل کرنے لگی ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ ریڈیو اور ٹیلی وژن نے کسی حد تک بچوں کو اپنے گرد جمع کرنا شروع کر دیا ہے لیکن بچوں کے پروگراموں کے اوقات ابھی گلیوں کے کھیل کے اوقات پر اثر انداز نہیں ہوتے اس لئے گلیاں آباد ہیں۔ گلیوں کو آباد رہنا چاہیئے کہ اب تو آبادی کے اضافے کے ساتھ ساتھ ہمارے ہاں پارکوں کی کمی محسوس کی جا رہی ہے اس لئے بچوں کی جسمانی نشوونما کے لئے گلیوں کے کھیل ضروری ہیں اور بچوں کی صحت کے مقابلے میں بعض گھروں کی کھڑکیوں کے شیشوں کا ٹوٹنا کچھ مہنگا نہیں کہ ہم خود اپنے اور اپنے بچوں کے لئے پارک بنانے پر پلازے بنانے کو ترجیح دیتے ہیں۔

ریڈیو، ٹی وی جہاں بچوں کی تفریح کا ایک ذریعہ ہیں وہاں یہ بچوں کی ذہنی نشوونما بھی کرتے ہیں اور شاید اسی لئے گلیوں کے کھیل کے اوقات کے بعد ان کا کام شروع ہو جاتا ہے ریڈیو اور ٹی وی کے بچوں کے پروگراموں کی مقبولیت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے اور اسی لئے ان پروگراموں کے لکھنے والوں کی ضرورت اور اہمیت بھی زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔

ریڈیو اور ٹی وی کے بچوں کے پروگرام لکھنا آسان نہیں ہے لیکن مشکل بھی نہیں اگر کوئی نوجوان اجلاغ کے ان دونوں ذرائع کے لئے لکھنا چاہے تو اس کے لئے صرف دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہو گا۔

۱۔ بچوں کی بنیادی نفسیات کا علم۔

۲۔ ریڈیو اور ٹی وی کے پروگراموں کے لوازمات (جن میں ضروریات اور مشکلات دونوں شامل ہیں) سے واقفیت۔

تفریح کے سلسلے میں بچوں کی نفسیات کا بنیادی نقطہ کھیل کود ہے۔

بالکل ہی معصوم بچے غیر شعوری طور پر ہر چیز کو اٹھا کر منہ میں ڈال لیتے ہیں۔ یا

itsurdu.blogspot.com

پھینک دیتے ہیں ان کے لئے دوسری کشش بصری ہے اور اس کا تعلق رنگوں سے ہے۔ پھر سنگھوڑوں کے ہلکوروں کی لذت ہے۔

اس سے آگے بڑھیں تو کھلونے ہیں، کھلونوں میں بھی رنگ، شور اور دلچسپ شکلیں قابل لحاظ ہیں ان میں جانوروں اور پرندوں کی طرف بچوں کا مائل ہونا قدرتی امر ہے۔ بچے ذرا بڑے ہو جائیں تو پھر جانور اور پرندے پالنے کا شوق ان کی تفریح کا ایک ذریعہ بنتا ہے دراصل یہ ساری چیزیں حواس خمسہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ بچے کے لئے دنیا نئی ہوتی ہے اور وہ نئے رنگوں اور نئی چیزوں کے نظاروں، موسیقی، نئی آوازوں کی رنگا رنگی، نرم و نازک پرندوں اور جانوروں کے دلکش لمس اور ذائقے کی نئی لذتوں سے آشنا ہوتے ہیں۔ اس عمر میں قوت شامہ دوسرے حواس کے مقابلہ میں کم کردار ادا کرتی ہے۔ گویا بچوں کے جو حواس سب سے زیادہ کردار ادا ہیں وہ بصارت، سماعت اور لمس ہیں۔

بچوں کے لئے ریڈیو اور ٹی وی پروگرام لکھنے سے پیشتر یہ دیکھنا ضروری ہے، کہ ذرائع ابلاغ میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا کیا مقام ہے اور یہ اپنے فرائض سے کس حد تک عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ ریڈیو کی طرح ٹی وی بھی ناظرین کے ایک چھوٹے سے گروپ کے لئے ہوتا ہے۔ ٹی وی بھی ریڈیو کی طرح روزمرہ کا معمول بن گیا ہے۔ لیکن ریڈیو کے برعکس ٹی وی پروگرام اسٹوڈیو میں بھی ہوتے ہیں، سٹوڈیو سے باہر بھی اور دونوں طرح بھی۔

جس طرح فلم میں کیمروں کا استعمال ہوتا ہے اور عمل کو ایک لینس کے ذریعے فلمایا جاتا ہے اور سکرین پر دیکھا جاتا ہے اور یہ عمل بیک وقت آواز اور تصویر کے ذریعے سے تکمیل پذیر ہوتا ہے اسی طرح ٹی وی پروگرام بھی بعض تکنیکوں کے حامل ہیں ان میں بعض فلم سے مماثلت رکھتے ہیں اور بعض فلم سے یکسر مختلف ہیں۔ تھیٹر کی طرح ٹی وی ایک زندہ ذریعہ ہے کہ یہاں بھی اداکار یا شرکا ایک مسلسل عمل سے گزرتے ہیں۔

فلم کے برعکس یہاں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں پروگرام ریکارڈ نہیں کیا جاتا۔ لیکن ریڈیو کے پروگراموں کے برعکس ٹی وی میں بصری اور سمعی دونوں قسم کی ضروریات کے سامنے سر خم کرنا پڑتا ہے۔ سٹیج سے یہ اس لحاظ سے مختلف ہے کہ یہاں ایک سیٹ سے دوسرے

سیٹ پر جانے کے لئے انتظار کی زحمت نہیں اٹھانی پڑتی۔

گویا ٹی وی، سٹیج، فلم اور ریڈیو سب سے الگ ایک خاص ذریعہ ہے لیکن ریڈیو کی طرح اس کا تعلق براہ راست آپ کے ڈرائنگ روم بلکہ بعض اوقات بیڈ روم سے ہے۔ یہ بہت حد تک فلم سے ملتا جلتا ہے کہ یہ ریڈیو کی محض صوتی کارکردگی سے آگے ہے۔ لیکن بہت حد تک ریڈیو اور تھیٹر کی خصوصیت کا حامل ہے کہ یہ فلم سے کمتر درجے کی شکل ہے، لیکن جہاں تک اس کی کارکردگی اور افادیت کا تعلق ہے ہر لحاظ سے اونچے درجے کی چیز ہے۔

اپنے طور پر یہ ایک نیا اور حیرت انگیز میڈیم ہے اس میں شبہ نہیں کہ تھیٹر اور فلم کا نعم البدل نہیں لیکن اس کی بہتر خصوصیات میں سے ایک اہم ترین یہ ہے کہ یہ دنیا ہی نہیں اب تو کائنات کا دریچہ بن گیا ہے آج کی دنیا کا جام جم ہے جس میں تمام تازہ بتازہ نظارے دیکھ سکتے ہیں، آوازیں سن سکتے ہیں۔

یہ سینما سے اونچے درجے کی چیز اس لئے بھی ہے کہ سینما کو بھی اس نے اپنی آغوش میں لے لیا ہے اور آج کے ٹیلی ویژن پروگرام اب ٹی وی کے سٹوڈیو کیمروں ہی سے نہیں فلم کے کیمروں، ٹیپ ریکارڈروں، وی سی آر، وی ٹی آر، ریڈیو ٹرانسمیٹروں، سٹلائٹ، غرض ہر چیز سے منسلک و متعلق ہو گئے ہیں اور اسی لئے ٹی وی اب سارے ذرائع ابلاغ سے زیادہ مؤثر ذریعہ بن گیا ہے۔ اب صرف بچوں کو ہی گھر میں پابند رکھنے کے لئے ٹی وی کی زنجیر کام میں نہیں لائی جاتی بلکہ بڑے آدمی بھی شام کی چہل قدمی، دوستوں کے گھر کی شام، کسی ادبی ثقافتی یا سیاسی جلسے، سینما یا باغ میں جانے کے بجائے اپنے ٹی وی روم کی رونق بنے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اکثر اوقات مہمانوں کو بھی خوش آمدید کہتے ہوئے کوفت محسوس کرتے ہیں۔

ریڈیو پر بچوں کے پروگرام ایک عرصے سے نشر ہو رہے ہیں ان پروگراموں میں بچے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ہر عمر کے بچے۔ یہ پروگرام عام طور پر کسی خاص عمر کے بچوں کے لئے نہیں ہوتے بلکہ ہر عمر کے بچوں کے لئے ان پروگراموں میں کوئی نہ کوئی چیز مل ہی جاتی ہے عام طور پر یہ پروگرام ۷ سے ۱۲ سال تک کی عمر کے بچوں کے لئے ہوتے ہیں کبھی کبھار ننھے منے بچوں کے لئے کوئی نظم نشر ہو جاتی ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے ہاں وسائل کی کمی کے

itsurdu.blogspot.com

باعث مختلف عمروں کے بچوں کے لئے الگ الگ پروگرام نشر نہیں ہو سکتے۔ جب ٹرانسمیٹروں کی تعداد بڑھ جائے گی۔ اور بچوں کو الگ چینل میسر آجائے گا۔ تو ہر عمر کے بچوں کے الگ الگ پروگرام نشر ہونے لگیں گے۔

فی الحال یہ دیکھا گیا ہے کہ ٹی وی پر بڑی عمر کے بچوں کے لئے پروگرام زیادہ نشر ہوتے ہیں حالانکہ ٹی وی ریڈیو کی نسبت چھوٹے بچوں کو اپنی طرف راغب کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ کہ اس میں بچوں کی بصری حس کی تسکین کے زیادہ سامان اور امکانات ہیں۔ صورت جو بھی ہو، نئے لکھنے والوں کے لئے ریڈیو اور ٹی وی پر لکھنے کی تکنیک سے آشنائی بنیادی بات ہے۔

ریڈیو، ٹی وی بچوں کے لئے جو پروگرام نشر کرتے ہیں ان میں بچوں کی نظمیں، موسیقی، کٹھ پتلیوں کا تماشا، ڈرامے، ذہنی آزمائش، سائنسی، جغرافیائی، تاریخی اور دوسری معلومات اور کھیل شامل ہیں۔

نظم کے لئے شاعر کا بچوں سے قرب، ان کی پسند اور ناپسند کی چیزوں کا علم، ان کی ذہنی تربیت کے لئے نئے نئے اور دلچسپ موضوعات کی تلاش، بچوں کی سمجھ کے مطابق ڈکشن کا استعمال ضروری ہے۔

ان نظموں کو ریڈیو پر نشر کرنا یا ٹی وی میں اس کے مطابق منظر نامے بنانا پروڈیوسر کا کام ہے۔ ٹی وی کا پروڈیوسر نظم میں بچوں کی دلچسپی کے مطابق بصری رنگ بھرنے کا کام جانتا ہے۔ اصل چیز تکنیک کا علم نئے لکھنے والوں کے لئے ضروری ہے ——— بچوں کے ڈرامے لکھنے کے لئے سب سے پہلے موضوع کا مسئلہ آتا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے بچوں کو پرندوں اور جانوروں سے بہت محبت ہوتی ہے۔ اور اس لئے وہ ایسے پروگرام دیکھنے کے متمنی ہوتے ہیں جن میں یہ پالتو جانور دلچسپ حرکتوں سے ان کو رجھائیں۔ یہ آپ جانتے ہی ہیں کہ ہمارے ملک میں نہ ملیک ہیوٹی کی طرح گھوڑے سدھانے کا ذوق ہے نہ سکن دی بُش کا نگرو جیسے باشعور کانگرو پالنے کا چسکہ ہے نہ لیسی (LASSIE) جیسے کتے ملتے ہیں۔ جو اپنے مالک کے تحفظ کے لئے اپنی جان لڑا دیں اور

نہ ڈالفن جیسی وفادار مچھلیوں کے مہیا ہونے کا احتمال ہے۔

دراصل ہمارے ماں والدین کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ بچوں کو ایسے جانوروں سے صرف کتاب یا تصویروں کے ذریعے متعارف کرانے پر اکتفا کریں۔ یہی سبب ہے کہ اس وقت سارے پاکستان صرف سوا دو چڑیا گھر ہیں۔ غیر ملکی ٹیلی ویژن کے ان پروگراموں سے مصنفین کو جانوروں کی صلاحیتوں کے مطابق کہانیوں کے موضوعات خود بخود مل جاتے ہیں لیکن ہمارے مصنفین کے پاس توتے دے کے تاریخی یا سائنسی موضوعات رہ جاتے ہیں۔ بھلا ہو شاہد کاظمی کا کہ ان کی وجہ سے بچے سائنس کے جدید کارناموں کی اچھی بُری نقل کو سکرین پر دیکھ تو لیتے ہیں جس کے سبب ان کا ذہن جدید دور کی ترقیات سے مانوس ہوتا جاتا ہے یا پھر کراچی سے دور رہنے والے بچے سمندر کی لہروں کا نظارہ کر لیتے ہیں۔

بہرصورت ایک سوچنے والے مصنف کے لئے موضوعات کی کوئی کمی نہیں۔ کہانی بننے کے لئے گھر ہے، جہاں امی ابو، بہن بھائی، ان کے مسئلے، ان کے جھگڑے، ان کی ایک دوسرے سے محبت، نفرت، گھر کی چیزیں اور گھر آنے والے مہمان موضوع بن سکتے ہیں، سکول ہے جہاں ہم جماعت، استاد، کلاس روم، پڑھاکو لڑکے، کام چور لڑکے، کتابوں کے کیڑے، شریر بچے، بے وقوف بچے، ذہین بچے، تاریخ کے قصے، ریاضی کے کمالات، جغرافیے کی وسعت جیومیٹری کی شکلیں، سائنس کے تجربات، پرندوں کے گھونسلے، کھیل کے میدان، کھیل کے میدان کے ہیرو، سکول کے باہر مختلف آوازیں لگاتے ہوئے خوانچہ فروش، خوانچہ فروشوں کی خراب چیزیں کھانے والے بچوں کا حشر، سکول کی بس، سب سے پیچھے رہ جانے والے بچے کلاس روم میں بند ہو جانے والے بچے کی مصیبت، کتابیں کھو جانے کا تنقیہ یا کسی طالب علم کی کتابیں پالینے اور مالک تک پہنچانے کی جدوجہد ——— موضوعات کا ایک انبار ہے پھر بازار بھی ہے۔ بازار کی ریل پیل، چہل پہل، ٹریفک، بد احتیاط بچے، محتاط بچے، بچوں کو اپنی طرف راغب کرنے والے بھی بھائی دکانوں کے شوکیس، شوکیسوں میں ترتیب سے رکھے ہوئے کھلونوں، کتابوں کی دکان۔ تصویروں کی کتابوں میں کھو کر ایلس کی طرح کہانیوں کی عجیب و غریب مملکت میں پہنچ جانے کے قصے۔ غرض موضوعات قدم قدم پر بکھرے

itsurdu.blogspot.com

ہوتے ملتے ہیں۔ تلاش شرط ہے۔

جہاں تک ریڈیائی ٹی وی ڈرامے کا تعلق ہے یہ کہانی کی ترسیل کا ایک ذریعہ ہے جس میں داستان گو کی بجائے کردار خود بولتے ہیں اس کے باوجود ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ڈرامے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

مناسب ہوگا کہ ان ذرائع ابلاغ کے حوالے سے ڈرامے کی بات ہو جائے۔

ڈرامے کی ۳ قسمیں ہیں :

۱۔ بصری یا صرف دیکھنے کے لئے یعنی خاموش ڈراما یا PANTOMIME۔

۲۔ بصری اور سمعی یا دیکھنے اور سننے کے لئے یعنی سٹیج ڈراما، فلم ڈراما اور ٹیلی ویژن ڈراما۔

۳۔ اور تیسری قسم ہے صرف سمعی یا سننے کے لئے یعنی ریڈیو ڈراما سننے اور محض سننے کی چیز ہے اس کا آنکھوں سے کوئی تعلق نہیں۔

سٹیج فلم اور ٹیلی ویژن ڈرامے میں بصری اور سمعی قوتیں ایک دوسرے کی معاون رہتی ہیں اور ہر شعبے کے خلا خود بخود پُر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن ریڈیو ڈرامے میں پردے، پس منظر اور چہرے کے اتار چڑھاؤ نہیں ہوتے۔ یہاں مناظر، بہار، خزاں، آندھی، طوفان، گرمی، سردی، لباس، حسن اور بدصورتی غرض ہر چیز آواز کی مرہون منت ہے۔ صوتی اثرات اور کرداروں کے مکالمے سن کر ذہن ان کے تمام اجزا کی تصویریں بناتا اور مٹاتا رہتا ہے۔ یہاں چیزوں کی لکیریں جذبات کی زبان نہیں ہو پاتیں بلکہ آواز کا زیر و بم جذبات اور خاصے کا کام بنتا ہے۔ لیکن اداکار کی محض جذباتی اداکاری سے بھی کام نہیں چل سکتا۔ اس کا انحصار مکالمے کی خوبصورتی، موزونیت اور پرکاری پر ہے اور اس لئے ریڈیو ڈراما سٹیج ڈرامے کی نسبت زیادہ کاوش، ذہانت اور تجربے چاہتا ہے۔

ڈراما سٹیج کا ہو، ٹیلی ویژن کا فلم کا یا ریڈیائی۔ اپنے مخصوص دائرہ عمل کے سبب بعض تکنیکی لوازمات کا مرہون منت ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ڈراما کوئی بھی ہو، ادب اور ہنر کے امتزاج کا نام ہے اور اس لئے اکثر نقادوں نے اسے خالص ادب کے زمرے سے

خارج کرنے کی سعی بھی کی ہے کسی حد تک یہ ایک حقیقت بھی ہے۔ ادبی تخلیق کے ساتھ ساتھ فنی لوازمات ڈرامے کا بنیادی عنصر ہیں اور اس لئے کوئی شخص بھی اگر سٹیج، فلم، ٹیلی، وژن یا ریڈیو کی ضروریات سے واقفیت نہیں رکھتا وہ کہانی تو تخلیق کرے گا ڈراما نہیں لکھ سکے گا۔

ریڈیو ڈرامے میں بھی مصنف کے ساتھ پیش کار رابرٹ کا شریک رہتا ہے اور اس لئے بعض ڈرامے جو مسودے کی حد تک نہایت غیر دلچسپ اور غیر ادبی ہوتے ہیں اچھی اداکاری اور اچھی پیش کش انہیں آسمان تک پہنچا دیتی ہے۔ پھر بھی ڈراما نویس کی ذہنی صلاحیت اور تجربہ الگ الگ اہمیت رکھتے ہیں۔ ڈراما نویس کی بعض ذمہ داریاں ہوتی ہیں چنانچہ اس نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ریڈیو کے ایک سربرآوردہ نقاد اصغر بٹ لکھتے ہیں :

"ریڈیو ڈرامے میں جو سب سے زیادہ تجربہ شروع کیا گیا اور جو اب تک جاری ہے، وہ ہے انسانی آواز سے شخصیت کی عکاسی۔ شخصیت میں دو طرح کی چیزیں پیش کرنا مقابلتاً آسان ہے، پہلی چیز ہے عمر، اس کے لئے بوڑھے ادھیڑ، جوان اور بچے کی آواز میں بآسانی امتیاز پیدا کیا جا سکتا ہے اور دوسری چیز ہے ٹائپ۔ ٹائپ سے مراد وہ خاص کردار جو اپنے طبقے کی نمائندگی کرتا ہو۔ مثلاً ایک فقیر جو فقیروں کی جانی پہچانی لجاجت سے بولے۔ ایک امیر جو امیرانہ رعونت سے بات کرے۔ ایک جذباتی عورت جو اپنے جذبات کے پل میں تولہ اور پل میں ماشہ ہونے کی وضاحت کرے۔ لیکن مشکل کہاں آن پڑتی ہے جہاں ایک امیر آدمی مغرور نہیں ہے اور ایک بھکاری امیر آدمی کے انداز میں بولتا ہے۔ کردار کے سماجی مقام یا شخصیت کی نوعیت کے بارے میں مکالموں میں اشارے رکھے جا سکتے ہیں لیکن یہ کمال ڈراما نویس کا ہے۔ پیش کار کا نہیں اور اگر ڈراما نویس نے ایسے اشارے نہیں رکھے تو کردار کی صحیح عکاسی کی تمام تر ذمہ داری اداکار پر آتی ہے۔ اداکار کردار کے گہرے نفسیاتی مطالعے سے استفادہ کر سکتا ہے اور سو میں سے ایک آدھ شخص شاید ایسا مل جائے جو خداداد ذہانت سے ایسی اداکاری کر سکے مگر ریڈیو ڈرامے

itsurdu.blogspot.com

کو ایسے شخص روز روز نہیں مل سکتے۔

ریڈیو ڈرامے کا فن عام ڈرامے کے فن سے مختلف نہیں یعنی اس کی بنیاد بھی کہانی، دلچسپی مکالمہ، کردار اور کشمکش یا تصادم پر استوار ہوتی ہے جو بات اسے ڈرامے کی دوسری قسموں سے جدا کرتی ہے وہی ریڈیو ڈرامے کو قدیم یونانی ڈرامے کی تکنیک سے ہمکنار کر دیتی ہے یعنی آواز اور مکالموں کے ذریعے مناظر اور کرداروں کی تشکیل۔ قدیم یونانی ڈراموں میں بھی سین سینریاں نہیں ہوتی تھیں جن سے موسم یا منظر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح یونانی ڈرامے کے کردار جذبات کی ترسیل کے لئے چہرے کے اتار چڑھاؤ کے رہین بھی نہ تھے بلکہ جنس کا پتہ دیتے تھے۔ کورس (یعنی آواز) باقی ساری ضروریات پوری کرنے اور لوگوں کو غیر موجود چیزوں کو مجسم کرنے کے لئے تخیل کی مدد لینے کی ترغیب دیتے تھے۔

ریڈیو ڈرامے میں بھی شکل و صورت، عمر، جنس، منظر، موسم، لباس کے لئے آواز کے ذریعے تخیل کی کارفرمائی مدد ہوتی ہے اور تخیل کو مہمیز دینے کے لئے مصنف کے بعض چھوٹے چھوٹے ایسے مکالماتی اشارے کافی ہوتے ہیں جو باموقع، متعلق اور موزوں ہوں اور ڈرامے کو آگے بڑھانے میں ممد و معاون ہوں۔ ریڈیو ڈرامے کی تکنیک میں بعض اہم امور ہیں۔

پہلی چیز تو کرداروں کے ہجوم کا مسئلہ ہے۔ ریڈیو ڈرامے کی طوالت ۴۰ منٹ سے ایک گھنٹہ اور بچوں کے لئے ۱۵ منٹ ہوتی ہے اور اتنی کم مدت میں زیادہ کردار سننے والوں کو الجھن میں ڈال دیتے ہیں۔ پھر یہاں یہ مشکل بھی سدِ راہ ہے کہ کرداروں کو یاد رکھنے یا پہچاننے کا ذریعہ صرف آواز ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی ڈرامے میں کرداروں کی افراط سے سارے کرداروں کو یاد رکھنا مشکل ہو جاتا ہے اس لئے تجربہ کار ڈراما نگار ریڈیو ڈراموں میں حتی الامکان کم سے کم کردار رکھتے ہیں۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن ڈرامے کا فرق دراصل ان دونوں ذریعوں کی تکنیک کے فرق پر منحصر ہے۔ اگرچہ ریڈیو اور ٹی وی والے ایک ہی انداز سے نشر کرتے ہیں مگر ٹی وی میں بیک وقت دو مکمل نشریاتی طریقوں سے کام لیا جاتا ہے۔ ایک بصارت کے لئے اور دوسرا سماعت کے لئے جبکہ ریڈیو جیسا کہ آپ جانتے ہیں صرف سماعت کے لئے ہے گویا ریڈیو

ایک نامکمل ٹیلی ویژن ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ٹیلی ویژن کو نفسیاتی، فنکارانہ اور تاریخی لحاظ سے غیر بصری ریڈیو کی ترقی یافتہ صورت نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ ہمارا احساس بصارت، احساس سماعت سے کہیں زیادہ اہم ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ بصارت اور سماعت الگ الگ بھی اپنے طور پر کام کرتے ہیں۔ غیر بصری ریڈیو کے مقابلے میں پینٹومائم (PANTOMIME) صرف بصارت والوں کی چیز ہے اور ٹیلی ویژن ریڈیو سے اسی لئے ایک الگ تشخص رکھتا ہے۔ ایک اچھا ٹی وی ڈراما وہی ہوتا ہے جو دوسرے کمرے میں سن کر پتے نہ پڑے۔ اور اگر ٹی وی ڈرامے میں صرف مکالمے ہی ہوں اور وہ دوسرے کمرے کے آدمی کی سمجھ میں آ جائیں تو پھر وہ ریڈیو ڈراما ہے۔ ٹی وی ڈراما نہیں۔ مجھے ٹی وی کا ایک ایسا ڈراما یاد ہے جس کی طوالت ۲۵ منٹ تھی اور اس میں صرف ایک مکالمہ تھا اور وہی مکالمہ ڈرامے کا نام بھی تھا۔ ان سارے ضروری لوازمات کو سمجھنے کے لئے کہانی کو ڈرامے کی شکل دینے کا مرحلہ آتا ہے۔ اس مقام پر مناظر کی مناسب تقسیم اور ترتیب، زمان و مکان کے تعین، مکالموں کی برجستگی اور ڈرامے کے منطقی ارتقاء کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ ریڈیو کے مسودے میں زمان و مکان کا تعین مکالموں اور صوتی اثرات کے ذریعے کیا جاتا ہے لیکن ٹی وی میں زمان و مکان کا تعین کوئی ایسی مشکل بات نہیں جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ ہمارا احساس بصارت، احساسِ سماعت سے کہیں زیادہ اہم ہے۔

ٹی وی ایک بصری ذریعہ ابلاغ ہے اس لئے وقت کا اندازہ سورج کے طلوع و غروب، سٹوڈیو میں روشنیوں کی کمی بیشی سے، کمروں میں کلاک اور ٹائم پیس کی موجودگی اور کرداروں کے بالوں کی رنگت اور چہرے کی تبدیلیوں سے ہو جاتا ہے۔ بعض مقامات پر پروڈیوسر یا لکھنے والا اپنی طبیعت کی اپج سے اڑتے ہوئے وقت کی تصویر کئی نئے نئے طریقوں سے پیش کرتا ہے۔ کہیں چکی کے چلنے سے، کہیں پہیئے کے گھومنے سے، کہیں کلاک کے پنڈولم کی حرکت وغیرہ سے۔

ٹی وی ڈرامے میں زمان و مکان کی پیش کش کی اچھی مثال سلیم احمد کا کھیل "تعبیر" ہے

itsurdu.blogspot.com

اس کھیل کا بنیادی مسئلہ ہی زمان و مکان ہے۔ وقت کا انقلاب ہے نئے لکھنے والے اس ڈرامے سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔

ٹی وی پر ڈرائنگ روم، کھانے کا کمرہ، باورچی خانہ، آنگن، سونے کا کمرہ، جلسہ گاہ، بازار، ہوٹل، درسگاہ، دفتر، سمندر کا کنارہ، باغ، پہاڑ، میاں تک کہ چاند کی سطح تک کی تصویر بھی بآسانی پیش کی جا سکتی ہے۔

آج کے دور میں ٹی وی میں مختلف قسم کے سٹوڈیو، کیمروں، ریکارڈوں اور مواصلاتی سیاروں کے ساتھ فلم کیمرہ بھی کام آتا ہے اس لئے لکھنے والے کے لئے ٹی وی کے ابتدائی دور کی طرح مختصر مناظر اور کم سے کم سیٹوں کا ڈراما لکھنے کی پابندی کا مسئلہ نہیں رہا۔ اس کے باوجود یہ مسئلہ اپنی جگہ موجود ہے اس لئے کہ فلم کے برعکس ٹی وی ڈراما بہت کم وقت میں تیار کیا جاتا ہے۔ اور اسی لئے بہت سے ممکن وسائل سے تھوڑے وقت میں کام لینا ممکن نہیں ہوتا، نیز پاکستان میں ہر سٹیشن پر بیک وقت پروجیکشن کی سہولتیں بھی میسر نہیں اس لئے کم سے کم سیٹ والی بات اپنی جگہ برقرار رہتی ہے اگر کوئی لکھنے والا یہ چاہے کہ وہ اپنے ڈرامے میں بے شمار مناظر شامل کر دے تو ان کو عمل جامہ پہنانا ٹی وی پروڈیوسر کے لئے ناممکن نہیں لیکن مجبوریوں، دشواریوں اور وسائل کی کمی کے باعث اسے الجھنوں میں ضرور ڈال دیتا ہے۔ یوں بھی مناظر کی بھرمار ٹی وی کے مختصر دور کے نئے کھیل کے لئے کوئی خوش آئند بات نہیں۔

ٹی وی سٹوڈیو ایک مختصر ساہال ہوتا ہے اس میں زیادہ سے زیادہ تین سیٹ بیک وقت لگائے جا سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کی توقع اس لئے بھی بے سود ہے کہ مطلوبہ سیٹوں کے علاوہ ایک سے زیادہ کیمروں، کیمرہ مینوں، ان کے ناٹوں، مائیکروفونوں اور ان کو دائیں بائیں کرنے والوں اور ان کو حرکت میں رکھنے والوں، روشنیوں کو اوپر نیچے کرنے والوں، جلانے بجھانے والوں، فلور منیجر اور دوسرے فنی عملے کی فوج کے لئے جگہ کی ضرورت ہوتی ہے پھر کیمروں کی موٹی موٹی کیبلوں کے ساتھ کیمروں کی نقل و حرکت کے لئے صاف اور وسیع فرش بھی درکار ہوتا ہے اس پر مستزاد اپنی باری کا انتظار کرنے والے اداکار بھی سٹوڈیو میں اپنی کھانسیوں کو روکے

موجود رہتے ہیں یہی سبب ہے کہ ٹی وی کے ہر قسم کے ڈرامے کے پروڈیوسر لکھنے والے سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ کم سے کم مناظر میں ڈراما لکھے۔ یوں ہر شخص زمان و مکان کے زیادہ الجھاووں میں نہیں پڑنا چاہتا۔ لیکن بعض ڈرامے ایسے ہوتے ہیں کہ اس کے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایسی صورت میں پروڈیوسر کو سٹوڈیو سے باہر نکلنا پڑتا ہے وہ باغ و راغ، جنگل، خوبصورت کوٹھیوں اصل بازاروں اور اصل گلیوں، حقیقی کھنڈروں اور وسیع کھیتوں اور فلم کیمروں، ادبی یونٹ، ای این جی اور وی سی آر (V. C. R) کی مدد لیتا ہے۔ اس کے باوجود کم سے کم سیٹ ٹی وی ڈرامے کی بنیادی ضرورت ہے اور اس کے لئے ڈرامہ لکھنے سے پیشتر ایک مفصل پلان بنانا ضروری ہوتا ہے جس میں ڈرامے کے مسودے کے ہر منظر کا خلاصہ، اداکاروں کی تفصیل اور یوں ہر سیٹ کا خاکہ بنانا ضروری ہوتا ہے۔

اب مسئلہ اداکاروں کا پیدا ہوتا ہے جیسا کہ ریڈیو ڈراموں کے ضمن میں عرض کیا گیا کہ زیادہ کرداروں کی وجہ سے اکثر اوقات آوازوں کی پہچان مشکل ہو جاتی ہے۔ ٹی وی ڈراموں میں زیادہ کرداروں کے ہجوم میں اصل کردار کے گم ہونے کا احتمال ہو جاتا ہے تاآنکہ لکھنے والا کرداروں میں لباس اور گفتگو کی انفرادیت کی وجہ سے ان کو ESTABLISH کرے۔ بچوں کے کردار نہ ہی ہوتے ہیں۔ لکھنے والوں کو یہ بات نہیں بھولنی چاہیئے کہ فلم کے برعکس ٹیلی ویژن میں اداکاروں کو مکمل سین زبانی یاد کرنے پڑتے ہیں۔ خصوصی طور پر بچوں کو طویل مناظر اور مکالمے یاد رکھنے میں دقت ہوتی ہے۔ یوں طویل مکالمے بڑوں کے لئے بھی لکھنا کوئی اچھی بات نہیں۔ مختصر مکالمات سے ایک تو ڈرامے کی تفہیم پر مثبت اثر پڑتا ہے۔ دوسرے یہ اداکاروں کے ساتھ تعاون کی ایک خوشگوار صورت بھی ہے۔

---

itsurdu.blogspot.com

بچوں کے لئے کتابیں

سید امتیاز علی تاج

رات کو ننھی سعیدہ یک لخت اٹھ کر بیٹھ گئی اور سہمی ہوئی آواز میں کہنے لگی! "امی امی کمرے میں شیر پھر رہے ہیں۔"

ماں بولی: "کچھ نہیں ننھی، کچھ نہیں، سو جاؤ۔" بچی کو پاس لٹا کر تھپکنا شروع کر دیا۔ لیکن ماں کے "کچھ نہیں" کہنے سے ننھی کی تسلی نہیں ہوئی اور وہ دو گھنٹے تک نہ سو سکی۔

دن کے واقعات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوا کہ ایک بی بی ملنے کے لئے آئی تھیں اور جنگلی جانوروں کی تصویروں کی ایک خوبصورت سی باتصویر کتاب ننھی کو بطور تحفہ دے گئی تھیں۔ ننھی تمام دن بڑے شوق سے اس کتاب کی رنگین اور خوبصورت تصاویر کو دیکھتی رہی اور ان تصاویر سے اس کے سادہ اور کمزور دماغ پر جو گہرا اثر پڑا تھا وہ اس صورت میں ظاہر ہوا۔

بظاہر یہ واقعہ معمولی ہوتا ہے لیکن ماہرین نفسیات کی رائے ہے کہ پختہ عمر لوگوں کی کئی عادات بچپن کے اسی قسم کے بظاہر معمولی اثرات کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔ ایسی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ بعض لوگ بڑی عمر میں خاص خاص چیزوں سے متنفر یا خائف رہتے ہیں۔ اور وجہ تحقیق کی جاتی ہے تو بچپن کا کوئی اسی قسم کا چھوٹا سا واقعہ معلوم ہوتا ہے، جس کا اس وقت کسی نے خیال بھی نہ کیا تھا۔

چونکہ سعیدہ کی ماں سمجھ دار عورت تھی، اس نے بچی کا دل بہلا لیا اور مناسب باتوں سے اس کا ڈر دور کر دیا اور دو گھنٹے کے بعد ننھی سعیدہ اپنی ننھی سی گلابی ہتھیلی پر سر رکھ کر اطمینان کی نیند سو گئی۔ لیکن اس واقعے سے بخوبی ظاہر ہے کہ جو کتابیں بچوں کے ہاتھ میں دی جاتی ہیں وہ ان کے دل و دماغ پر کس قدر اثر کرتی ہیں۔

ہم اپنے بچوں کو پروان چڑھاتے وقت اس امر کا خیال رکھتے ہیں کہ اپنے مقدور کے

مطابق ان کی ضروریات کا بہترین سامان مہیا کریں۔ ہم انہیں اچھی سے اچھی غذا اور اچھے سے اچھا کپڑا تو دیتے ہیں لیکن پڑھنے کے لئے جو کتابیں ان کو دی جاتی ہیں ان میں ہم ذرا بھی احتیاط سے کام نہیں لیتے۔ حالانکہ دل و دماغ کو متاثر کرنے میں کتابیں بہت بڑا حصہ لیتی ہیں۔

ماہرین کی رائے ہے کہ جو کتابیں بچوں کو پڑھنے کے لئے دی جائیں ان کا معیار ظاہری اور باطنی دونوں حیثیتوں سے بلند ہونا چاہیئے۔ ظاہری محاسن میں سب سے پہلے اس امر کا خیال رکھنا چاہیئے کہ حروف خوب جلی اور خوش خط ہوں۔ عجیب بات یہ دریافت ہوئی ہے کہ الفاظ کا جلی ہونا بچوں کے لئے اس قدر اہمیت نہیں رکھتا جس قدر سطروں کا درمیانی فاصلہ، یعنی قریب قریب لکھی ہوئی سطروں میں خواہ جلی قلم ہی استعمال کیا گیا ہو، بچہ انہیں آسانی سے نہ پڑھ سکے گا اور قلم خواہ نسبتاً خفی استعمال کیا جائے لیکن بین السطور زیادہ ہو تو بچہ اسے آسانی سے پڑھ لے گا۔ چنانچہ بچوں کے لئے جو کتابیں لکھی جائیں ان میں سطریں باہم اس قدر دور ہونی چاہئیں کہ بچے کی آنکھ آسانی کے ساتھ ہر سطر کا علیحدہ علیحدہ خیال رکھ سکے۔ اگر سطریں قریب قریب ہوتی ہیں تو بچہ ایک سطر پڑھ چکنے کے بعد پھر اسی کو پڑھنے لگتا ہے اور پریشان ہو جاتا ہے چھاپے کی روشنائی بہت سیاہ ہونی چاہیئے تاکہ سیاہ حروف کاغذ پر خوب نمایاں ہوں۔ اکثر کتابوں میں کاغذ اس قدر باریک لگایا جاتا ہے کہ ایک طرف کا چھاپہ دوسری طرف سے جھلکتا دکھائی دیتا ہے اور اس طرح سپید زمین پر سیاہ حروف کا مناسب اثر کھو دیا جاتا ہے۔

بچوں کی آنکھوں کی تربیت خاص توجہ کی محتاج ہوتی ہے اور اگر ذرا ذرا سی باتوں کو نظر انداز کر دیا جائے گا تو ان کی بصارت پر اس کا بہت برا اثر پڑتا ہے۔ شاید عام طور پر معلوم نہ ہو کہ بارہ برس کی عمر تک بچے کی آنکھیں اس قابل نہیں ہوتیں کہ کسی قریب کی چیز پر بخوبی جم سکیں۔ آنکھ کچھ اس طرح بنی ہے کہ بڑی عمر میں بھی قریب کی چیز پر نظر جمانے کے لئے خاص زور لگانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ بڑی عمر میں لوگ اس طرح زور لگانے کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں کہ اسے محسوس نہ کریں۔

کسی سمت خاص اور مختلف فاصلوں پر نظر قائم کرنے کے لئے آنکھوں کے عضلات کے

itsurdu.blogspot.com

نشوونما کی ضرورت ہے اور جب تک بڑے اعصاب جو ہاتھ پاؤں کی مناسب حرکات پیدا کرتے ہیں، نشوونما نہ پا جائیں۔ ان ننھے اعصاب کی باری نہیں آتی۔

بعض ماہرین جن وجوہ سے چھوٹی عمر میں بچوں کو نوشت و خواندگی کی تعلیم دینا مناسب نہیں سمجھتے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے اور اسی خیال سے بعض ممالک میں یہ دستور ہے کہ چھوٹی عمر میں بچوں کے عینک لگا دی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کی آنکھیں ضرر پہنچنے سے بچی رہتی ہیں اور جوان ہونے پر عینک اتار دی جاتی ہے۔

تصاویر کے متعلق بھی خاص خیال رکھنا چاہیئے۔ ۵-۶ یا ۷ برس تک کی عمر کے بچے کے لئے شیروں اور سانپوں اور مہیب چیزوں یا واقعات کی تصاویر ضرر رساں ہیں اور وہ عام طور پر ان کو پسند بھی نہیں کرتے۔ اگرچہ تصویر کا اثر بہت کچھ اس بات پر منحصر ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ عبارت کیا ہے یا اس کے متعلق بچوں کو زبانی کیا کچھ بتایا جاتا ہے۔ تاہم عام اصول یہ ہونا چاہیئے کہ بچوں کی کتابوں میں اس قسم کی تصاویر ہوں کہ جب وہ سونے کے لئے لیٹیں تو ان کو یاد کر کے ان کا دل خوش ہو۔ پھولوں، چڑیوں، خوبصورت بچوں اور ایسی سادہ چیزوں کی تصاویر ہوں، جن کو اپنی روزمرہ زندگی میں وہ دلچسپی کی نظر سے دیکھتے ہیں کہیں کوئی بچی گڑیا لئے بیٹھی ہو، کہیں کوئی بچہ باجا بجا رہا ہو، کہیں بائیسکل کی تصویر ہو، کہیں گاڑی ہو۔

بچوں کو شوخ رنگ بہت پسند ہوتے ہیں ان کے متعلق مشہور ہے کہ جس طرح زمانۂ قدیم کے انسان بہت تیز رنگوں پر جان دیتے تھے۔ اسی طرح بچے بھی ان پر فدا ہیں۔ ایک فرد ایک کمیٹی نے بہت سے بچوں کی پسند کا امتحان لیا کہ یہ نتیجہ نکالا تھا کہ عام طور پر بچوں کو سبز رنگ بہت بھاتا ہے اور خصوصاً اس قسم کا سبز رنگ جیسا عموماً درختوں کے پتوں کا ہوتا ہے اس سے اتر کر لال، نیلے اور پیلے رنگوں کی باریاں آتی ہیں۔ اکثر لوگوں کو معلوم ہوگا کہ سبز رنگ آنکھوں پر بہت فرحت بخش اثر ڈالتا ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ بچہ اس رنگ کی پسند کا مذاق قدرت کی طرف سے لے کر آیا ہے۔

اندریں حالات بچوں کی کتابوں میں شوخ رنگ کی تصاویر ہونی چاہئیں اور ایسی تصاویر جن میں سبز رنگ نمایاں ہو، تصاویر میں بہت سے آدمی یا بہت سی چیزیں بیچ بیچ نہیں ہونی

چاہئیں۔ سیدھی سادی کسی ایک چیز کی تصویر ہو اور اس میں ایسے رنگ ہوں جو بچے کو مرغوب ہوں۔ اسی قسم کی تصاویر اگر ان کی کتابوں میں اور ان کے کمرے کی دیواروں پر بھی ہوں تو بچے بہت خوش ہوں گے۔

اب ہم کتابوں کے باطنی محاسن پر توجہ کرتے ہیں، گو ان خوبیوں کی کتابیں اردو زبان میں بہت کم ہوں گی۔ لیکن لوگوں کو ان کی ضرورت کا احساس ہو گیا تو پیدا ہونے میں دیر نہ لگے گی۔

بچے کی دلچسپی کی چیزیں اتنی بہت ہیں کہ ان میں سے چند کو منتخب کرنا بہت دشوار ہے بچوں کی تعلیم کا تازہ ترین اصول یہ ہے کہ انھیں کام اور کھیل میں فرق نہ معلوم ہو۔ یعنی وہ یہ نہ سمجھنے پائیں کہ اب کھیل کا وقت تمام ہوا اور کام کی مصیبت شروع ہو گئی۔ کام کو اس قدر دلچسپ اور دلفریب بنایا جائے۔ کہ وہ اسے دوسرا کھیل سمجھ کر اس کی طرف بھی اسی رغبت سے متوجہ ہوں۔ چنانچہ اب سبق کی کتابوں اور محض دلچسپ کتابوں کا فرق دن بدن کم ہو رہا ہے مصنفین پہلے اس بات پر غور نہیں کرتے کہ بچوں کو کیا سنانا چاہیئے وہ یہ سوچتے ہیں کہ بچے کیا سننا چاہتے ہیں وہ اپنی رائے پر عمل کر کے بچے کی فطرت پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتے بچے کے رجحان طبع کا خیال کر کے اپنے اوپر جبر کرنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔

بچے کی تعلیم و تربیت میں اور اسے پڑھنے کے لئے کتابیں دیتے ہوئے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ خود کس چیز سے دلچسپی لیتا ہے، جس چیز کو وہ خود پسند کرے اس کے متعلق اسے بچپن ہی میں معلومات دی جا سکتی ہیں مثلاً ایک برس کی عمر کا بچہ رات کے وقت بستر پر لیٹ کر ستاروں کے متعلق باتیں کرتا ہے۔ اس بچے کو بڑی آسانی سے نظام شمسی کے متعلق موٹی موٹی ابتدائی اور دلچسپ باتیں سکھائی جا سکتی ہیں۔ بعض بچوں کو پھولوں کا بہت شوق ہوتا ہے وہ پھولوں کے نام اور ان کے رنگوں اور موسموں کے متعلق معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ ایسے بچوں کو اس قسم کی کتابیں پڑھنے کے لئے دی جائیں جن میں ان چیزوں کی بابت بہت آسان، دلچسپ اور باتصویر سبق، کہانیوں کے پیرائے میں ہوں۔

ایک بڑی دقت یہ ہے کہ ہندوستان میں بچوں کی تعلیم کا ایک خاص پروگرام والدین

itsurdu.blogspot.com

اور استادوں کے دماغ میں اس قدر جگہ پا چکا ہے کہ وہ اس سے سرِمُو انحراف کرنا پسند نہیں کرتے۔ ان کی رائے میں ضروری ہے کہ پہلے بچہ الف بے پڑھے، پھر عبارت میں اخلاق پر چند مضامین کا مطالعہ کرے۔ پھر ریاضی کا مطالعہ شروع ہو وغیرہ وغیرہ، اگر بچے کی طبیعت اور اس کا فطری رجحان اس سانچے میں پورا نہیں اُترتا تو کوشش کی جاتی ہے کہ اسے زبردستی اس سانچے میں ڈھالا جائے۔

تحریر میں دل چسپی لینے سے پہلے تقریر میں دل چسپی لینے کا مرحلہ آتا ہے اور ضرورت ہوتی ہے کہ ان کی پسند کی چیزوں پر زبانی انھیں کچھ نہ کچھ معلومات دی جائیں۔ گھر کی معمولی سادہ سادہ چیزوں کا جنھیں بچہ ہر وقت دیکھتا ہے۔ مطالعہ کرنا سکھایا جائے اور بتدریج نوشت و خواندگی کی طرف متوجہ کیا جائے۔

تجربوں سے معلوم ہوا ہے کہ ۷ برس سے کم عمر کے بچے کا دماغ نہایت ابتدائی حالت میں ہوتا ہے اور دنیا اسے ایک پیچیدہ گورکھ دھندا معلوم ہوتی ہے لیکن چونکہ وہ کچھ کچھ چیزوں کے سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے اس لئے بالطبع چاہتا ہے کہ اردگرد کی تمام چیزوں کو فوراً سمجھ لے ایسے موقعوں پر ضرورت اسی احتیاط کی ہوتی ہے کہ زیادہ چیزوں سے اس کا دماغ پریشان نہ کیا جائے۔ اگر اسے بہت سی چیزوں سے روشناس کیا گیا تو وہ سب کچھ سمجھ لینے کے شوق اور جلدی میں ایک چیز کو بھی پوری طرح نہ سمجھے گا۔ اس لئے اس کی دنیا کو زیادہ وسیع کرنے کی بجائے اور مختصر کر دینا چاہیئے کہ وہ باری باری ایک ایک چیز کو خوب اچھی طرح دیکھے۔ اور سمجھے اور جب ان چیزوں سے پورے طور پر واقف ہو جائے اور چیٹ بھر کر ان سے لطف اٹھا چکے، پھر اس کے مطالعے کی دنیا بتدریج زیادہ وسیع کرتے جائیں مثال کے طور پر گھروں میں مرغیاں، بلیاں، چڑیاں وغیرہ جانور ہوتے ہیں۔ بچہ ان ہی کو دیکھے اور ان ہی سے کھیلے اسے چڑیا گھر ہرگز نہ لے جائیں۔ ہاں جب بچہ اپنے گھر کی سیر سے تھک جائے اور وہاں کی چیزوں میں دلچسپی لینا چھوڑ دے تو پھر اسے چڑیا گھر دکھانا مناسب ہے۔

ان ذرا ذرا سی باتوں کا شروع ہی میں خیال رکھنے سے بعد میں حیرت انگیز نتائج نکلتے ہیں اور اسی قسم کی بے پروائی کا نتیجہ ہے کہ آج کل کے ۹۰ فیصد بڑی عمر کے لوگ محض سطحی

مطالعے کے عادی ہیں اور بہت کم چیزوں سے گہرا واقف ہوتے ہیں انہیں بچپن ہی سے یہ عادت ہوتی ہے کہ ایک چیز کا مطالعہ پوری طرح ختم نہیں ہونے پاتا کہ دوسری چیز پر ہاتھ ڈال دیتے ہیں اگر احتیاط سے کام لیا جاتا تو انہیں بڑی آسانی اور بڑے مزے میں چیزوں کے مکمل مطالعے کی عادت پڑ جاتی۔

عام اشیاء کے بعد تصاویر کے مطالعے کی باری آتی ہے۔ اگر بچے نے ایک چیز کو اچھی طرح دیکھا بھالا اور سمجھ لیا ہے تو وہ کاغذ پر اس کی تصاویر دیکھتے ہی اسے پہچان جائے گا۔ اس کے دماغ کو زیادہ تکلیف نہ ہوگی اور اپنی اس کامیابی سے اس کو بہت خوشی ہوگی۔ کچھ عرصے تک تصاویر کا مطالعہ کرنے کے بعد بچے کو معلوم ہو جائے گا کہ چیزیں کاغذ پر نقشات کے ذریعے کس طرح ظاہر کی جا سکتی ہیں۔

جب یہ بات اچھی طرح ذہن میں بیٹھ گئی تو بچہ حروف و الفاظ کو بھی بہت دل چسپی کے ساتھ سیکھے گا۔ کیونکہ حروف بھی آخر آوازوں ہی کی تصاویر ہیں اور یوں مادی اشیاء سے ہٹ کر وہ بآسانی اشیاء کے مطالعے کی طرف راغب ہو سکے گا۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر اول گھر کی معمولی چیزوں سے، پھر تصویروں سے اور اس کے بعد الفاظ کے ذریعے اگر بچے کو بتدریج معلومات دی جائیں تو یہ طریقہ تعلیم بے انتہا مفید ثابت ہوگا۔

بعض عالموں کا خیال ہے کہ دنیا میں جس طرح انسان نے وحشیانہ زندگی سے بتدریج تہذیب و تمدن کی طرف ترقی کی ہے اسی طرح ہر بچہ اپنے وجود میں دنیا کی یہ تمام تاریخ دہراتا ہے۔ زمانہ قدیم کے انسانوں نے رہنے کو ٹھکانے بنائے۔ دنیا کی موٹی موٹی چیزوں کے نام مقرر کئے، آگ اور ہتھیار ایجاد کئے۔ جانور پالے، اردگرد کی چیزوں کو سمجھا، سفر کئے۔ اس کے بعد خیالی چیزوں کی طرف رخ کیا۔ اور ان میں مصروف ہوئے۔

یہی حالت بچے کی ہے وہ ترقی کے ان تمام مراحل میں سے چند سالوں میں گزرتا ہے اس کے لئے بھی سمجھنے اور ایجاد کرنے اور سفر کرنے اور غور و فکر کے زمانے یکے بعد دیگرے اسی طرح آتے ہیں۔ جب اس کے سمجھنے کا زمانہ ہو تو اسے سادہ سادہ چیزیں سمجھنے کی کتابیں دینی چاہئیں، جب ایجاد کا زمانہ ہو تو ایسی کتابیں پڑھائیں جن میں چیزوں کے بنانے کا بیان ہو۔

itsurdu.blogspot.com

اور پھر سیر و سیاحت اور سفر کی دلچسپیوں کے حالات وغیرہ جیسی ضرورت ہو۔

ہندوستان میں عام طور پر یہ خیال ہے کہ ننھے بچوں کے لئے کہانیوں سے زیادہ دلچسپ چیز اور کوئی نہیں۔ مگر بعض ماہرین تعلیم اس سے اختلاف رکھتے ہیں۔ اہل تجربہ نے معلوم کیا ہے کہ کہانیوں سے پہلے ان میں ایجاد کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ نیز ننھے بچے کے لئے اپنی زندگی ہی اتنی واقعات سے پر اور منہمک رکھنے والی ہوتی ہے کہ اسے اوروں کی زندگیوں یعنی کہانیاں پر غور کرنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔ اگر بجائے کہانیوں سنانے یا کتابوں میں سے پڑھانے کے انہیں ان کی سمجھ کے مطابق ننھی ننھی چیزیں بنانا بتایا جائے تو وہ ان میں زیادہ دلچسپی لیں۔

اس کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ کرنا درست نہیں معلوم ہوتا۔ انسان کے دماغ میں مختلف خواہشیں اعصاب کے ذریعے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ اعصاب تار کے جال کی طرح تمام جسم میں پھیلے ہوئے ہیں اور دماغ کے خاص خاص حصوں میں ایک مرکزی مقام کسی خاص خواہش کا مرکز ہوتا ہے۔ جوں جوں یہ مختلف خواہشوں کے مرکز نشوونما پاکر ابھرتے ہیں۔ ان کے ساتھ وہ خواہشیں بھی ہوتی ہیں جن کی جڑ ان مرکزوں میں ہوتی ہے۔ لیکن ان اعصابی مرکزوں کا نشوونما ہر بچے میں یکساں وقت پر نہیں ہوتا۔ اس لئے ان کی خواہشیں اور شوق بھی آگے پیچھے اور کمی و بیشی ہوتے ہیں۔ چنانچہ جس عمر کے بچوں کے لئے کتاب لکھی جائے۔ ضروری ہے کہ پہلے تجربے سے اس عمر کے بچوں کا رجحان طبع معلوم کیا جائے۔

یہ تمام باتیں اس لیے بیان کی گئی ہیں کہ عام طور پر معلوم ہو۔ بچوں کے لئے کتابیں لکھنا کتنے غور و خوض، محنت اور تجربے کا محتاج ہے اور جو لوگ صحیح اصولوں پر اپنے بچوں کو تربیت دینا چاہتے ہیں وہ سمجھ سکیں کہ انہی بچوں کے لئے کتابیں منتخب کرتے وقت ان میں کیا باتیں دیکھنی چاہئیں۔

عام طور پر بچوں کے لئے جو کتابیں لکھی جاتی ہیں ان میں سلاست سے کام لیا جاتا ہے لیکن سلاست کے یہی معنی ہیں کہ کتاب میں عربی اور فارسی کے بڑے بڑے الفاظ نہ ہوں۔ ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ الفاظ خیالی چیزوں کے نہیں بلکہ مادی چیزوں کے ترجمان ہوں

ورنہ بچے ایسے لطف اندوز نہ ہو سکیں گے۔

مثلاً بچوں کے لئے اس قسم کے فقرے بے معنی ہیں۔ کہ برائی کا نتیجہ برائی ہے انہوں نے نہ کبھی برائی کو دیکھا ہے نہ نتیجے کو۔ چنانچہ وہ واضح طور پر اس بات کا مطلب نہیں سمجھ سکتے لیکن اگر اس کی بجائے لکھا جائے:

"اگر تم نے کسی کے پتھر مارا تو وہ بھی سامنے سے پتھر مارے گا" تو اس کا مطلب آسانی سے ان کے ذہن نشین ہو سکتا ہے۔

ایک یہ خیال بھی بہت عام ہے کہ بچوں کے لئے کتابیں مکالمے میں ہونی چاہئیں۔ چنانچہ مصنفین معلومات کے مضامین کے دو حصے دو لوگوں کی زبانی بیان کر کے اس فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ مکالمہ بیان سے زیادہ ثقیل اور بیان مکالمے سے زیادہ پر لطف ہو سکتا ہے۔ اگر مناسب طریق پر محنت سے اور سوچ سمجھ کر تیار کیا جائے۔

ایک اور نہایت اہم بات بچوں کی تعلیم میں یہ ہے کہ خوف و خرم سے انھیں ایک حصۂ جسم کی غرض و غایت سے بالکل تاریکی میں رکھا جاتا ہے جس کے نتائج بعض اوقات بعد میں بہت برے نکلتے ہیں۔

یورپ کو بہت تلخ تجربوں کے بعد اس کو بھی روشنی میں لانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس قسم کے مضامین بچوں کے نصاب میں داخل کئے جا رہے ہیں۔ ہندوستانی ماں باپوں کو بھی چاہیئے کہ وہ اپنے بچوں کو مناسب الفاظ اور مناسب ڈھنگ سے ایسی نصیحتیں کرتے رہیں کہ وہ کسی غلطی میں نہ پڑیں یا انہیں اس قسم کی کوئی مناسب تصانیف پڑھائیں۔

اس مضمون میں بچوں کی تعلیم کے متعلق بہت مختصر طور پر بعض مغربی ماہرین تعلیم کے خیالات ظاہر کئے گئے ہیں گو مضمون تشنہ ہے۔ تاہم اس سے اتنا تو معلوم ہو جاتا ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت مغرب میں کتنا اہم مسئلہ ہے اور اس پر کس قدر غور و فکر کیا جا رہا ہے مگر ہمارے ہاں آئندہ نسل بھیڑوں بکریوں کی طرح پرورش پاتی ہے۔ والدین اتنا پوچھنے تک کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ ہم بچوں کو کیا پڑھائیں۔ وہ اپنے بچوں کی تعلیم کے اصولوں

itsurdu.blogspot.com

سے بے خبر مدرسین کے سپرد کر کے اپنے خیال میں ایک بڑے فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں اور ان کے جسمانی قویٰ کو نہایت اطمینان سے برباد ہونے دیتے ہیں۔ نہ کسی کو بہتر تعلیم دینے کا خیال آتا ہے اور نہ بچوں کے لئے اعلیٰ اصولوں پر کتابیں لکھی یا لکھوائی جاتی ہیں ـــــ اس مضمون میں ہندوستانی ماں باپ کو صرف آگاہ کیا گیا ہے کہ ان کے بچوں کی آسان، دلچسپ اور اعلیٰ تعلیم کے لئے ان کی نصابی کتابوں کا سلسلہ کس روش پر ہونا چاہیئے اگر انہوں نے اپنے بچوں پر ترس کھا کر اس ضرورت کو محسوس کیا تو ان کی توجہ یا اصرار مناسب کتابیں اردو میں پیدا کر سکتا ہے ؛

(انتخاب از کہکشاں)

بچوں کی کتابوں کی زبان

ـــــ انتظار حسین

بچوں کی کتابوں کا سوال میرے لئے کسی قدر اجنبی ہے وہ اس لئے کہ میں نے اپنے بچپن میں کبھی بچوں کی کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی۔ میں کہانیاں پڑھتا نہیں تھا، سنتا تھا پھر جب میں پڑھنے کی منزل میں داخل ہوا تو اسی پہلے ورقوں والی بدنام کتاب الف لیلیٰ پر میں نے ڈاکہ ڈالا، جو میرے بڑوں نے اپنے پڑھنے کے لئے خریدی تھی۔ مگر یہ کتاب بھی میں نے ایسے پڑھی جیسے پڑھ نہیں رہا ہوں۔ بلکہ سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔ یہ پتہ مجھے بڑے ہو کر چلا کہ جس زمانے میں میں بڑوں کے لئے لکھی ہوئی الف لیلیٰ پڑھ رہا تھا۔ اسی زمانے میں لاہور سے بچوں کا رسالہ 'پھول' بھی نکلتا تھا اور بچوں کے لئے کہانیوں کی کتابیں بھی شائع ہوتی تھیں مگر پھر کیا ہو سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میں نے رسالہ 'پھول' پڑھے بغیر ہی بچے سے بڑا بن گیا تھا۔

اصل میں 'پھول' کی اشاعت ہماری تہذیب کے ساتھ ایک حادثہ ہے۔ یہ حادثہ جس بڑے حادثے کی پیداوار ہے اسے ہم چھاپہ خانہ کہتے ہیں۔ نہ چھاپے خانے ہوتے نہ بچوں کے لئے کہانیاں لکھی جاتیں نہ رسالہ 'پھول' شائع ہوتا۔

بچوں کا ادب اس سے پہلے اگر تھا تو کہنے سننے کی روایت میں تھا۔ لکھنے پڑھنے کی روایت میں نہیں تھا۔ اصل میں بچوں کا ادب الگ تھا ہی نہیں۔ نکشن یعنی قصہ کہانی کی وہی ایک مشترکہ روایت تھی۔ وہی الف لیلیٰ کی کہانیاں اور وہی شیخ سعدیؒ کی حکایتیں۔ جب نانیاں دادیاں یا کوئی بڑا بوڑھا بچوں کو سناتا تھا تو وہ بچوں کا ادب بن جاتا تھا۔ اس مشترکہ ادبی روایت میں رخنہ چھاپے خانے نے پیدا کیا۔ یہاں میں وائٹ ہیڈ کا ایک بیان نقل کروں گا۔ انھوں نے اپنی کتاب AIMS OF EDUCATION میں لکھا ہے کہ 'ہملٹ' کو تو پڑھا ہی جا سکتا ہے مگر 'اوڈیسی' کا مسئلہ یہ ہے کہ بچے پڑھنے

itsurdu.blogspot.com

کی منزل سے پہلے ہی اپنی دادی کے طفیل اوڈیسس کے ساتھ ساتھ دیس دیس گھوم پھر چکے ہوتے ہیں۔

مجھے یہ نہیں معلوم کہ مغربی دنیا میں دادی اماں کا انتقال کب ہوا اور کب یہ سوال پیدا ہوا کہ "الیڈ" اور اوڈیسی کے قصوں کو آسان زبان میں بچوں کے لئے لکھا جائے۔ مگر ہماری دنیا میں "پھول" کے وقت دادی اماں زندہ تھیں اور روز رات کو پوتوں پوتیوں کو جمع کر کے منہ سے پھول برساتی تھیں ——— اس کا ایک خوشگوار اثر دارالاشاعت پنجاب کی چھاپی ہوئی بچوں کی کتابوں پر بھی پڑا۔ اس وقت بچوں کے لئے جو کہانیاں لکھی گئیں ان میں یہ کوشش نظر آتی ہے کہ کہانی اس طرح لکھی جائے جیسے وہ سنائی جائے ہے۔ اس سے پہلے یہ کوشش نظم اور نثر دونوں میدانوں میں مولوی اسماعیل میرٹھی اور مولانا محمد حسین آزاد کر چکے تھے۔ ان کی لکھی ہوئی نظم و نثر میں دادی اماں اور بڑے ابا کے لہجے زندہ ہیں۔

مگر اسماعیل میرٹھی اور مولانا محمد حسین آزاد کا زمانہ اور رسالہ پھول کا زمانہ۔ یہ دونوں زمانے گزر چکے ہیں۔ دادی اماں اللہ کو پیاری ہوئیں۔ اب معصوم بچے ریڈیو، ٹیلی وژن اور نئے ناشروں کی زد میں ہیں۔

ان اداروں نے ایک موٹا سا اصول گرہ میں ضرور باندھا ہے کہ بچوں کے لئے جو لکھا جائے وہ آسان زبان میں لکھا جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی شائع کی ہوئی یا نشر کی ہوئی تحریریں اس شرط کو بھی پورا نہیں کرتیں۔

بہرحال آسان زبان کا کیا ہے وہ تو سرسید احمد خاں بھی لکھ لیتے تھے۔ آسان زبان ایسی بھی تو ہو سکتی ہے جو نری کتابی ہو اور آج کل بچوں کے لئے کہانیوں کی جو کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ ان کی کم و بیش یہی صورت ہے۔ ان کتابوں میں زبان قواعد کے اعتبار سے درست بھی ہوتی ہے اور آسان بھی ہوتی ہے۔ بس لفظ زندہ نہیں ہوتے۔

لکھنے والوں نے بچوں کے لئے لکھنے کے مسئلے کو بالعموم یوں سمجھا ہے کہ فقرے لمبے اور پیچیدہ نہ ہوں، فارسی عربی الفاظ کی بہتات نہ ہو۔ قواعد کی رو سے عبارت درست ہو اور کہانی واضح طور پر بیان ہو جائے مگر مسئلہ اصل میں اور ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا

تھا کہ میں نے الف لیلیٰ اس طرح پڑھی جیسے میں سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔ کہانی کو واضح طور پر بیان کرنا نہ تو "الف لیلیٰ" کا مقصود ہے اور نہ دادی اماں کا مقصود تھا۔ جو سیدھے سچے لفظوں میں کہانی سنایا کرتی تھیں۔

یہ پرانی کہانیاں بنی نوع انسان کی مہمات ہیں۔ انسان روح کی واردا تیں ہیں۔ یہ واردا تیں جن استعاروں میں بیان ہوئی ہیں۔ ان استعاروں میں کہانیاں لکھنے والوں اور بیان کرنے والوں کا ایمان تھا۔ لمبی سے لمبی کہانی چند گھنٹوں میں ختم ہو سکتی ہے مگر میری نانی اماں جب کہانی سناتی تھیں تو راتیں گذر جاتی تھیں اور کہانی ختم نہیں ہوتی تھی۔ بات یہ تھی کہ وہ کہانی تو خود ان کے لئے بھی واردات تھی۔ جب پرانے زمانے کی کوئی نانی دادی کہانی سناتی تھی تو وہ بھی احساس کی اسی سطح پر تحیر اور تجسس کی اسی منزل میں ہوتی تھی جس میں سننے والا بچہ ہوتا تھا اور سننے والا اور سنانے والا دونوں انسانی تخیل میں ایمان رکھتے تھے اور ایلیٹ نے نثر کی بحث میں ایک بات یہ کہی ہے کہ ایمان بغیر اچھی نثر نہیں لکھی جا سکتی۔

مولانا محمد حسین آزاد تو انسانی تخیل میں بہت گہرا ایمان رکھتے تھے جبھی تو انہوں نے اتنی اچھی تخیل نثر لکھی اور جبھی ان کے لئے یہ ممکن ہوا کہ بچوں کے احساس کی سطح پر آ کر ان کے لئے اچھی نثر لکھیں۔ رہوں تو میں عقل کا بندہ اور تخیل اور اس سے جنم لینے والے عظیم استعاروں کو سمجھوں۔ توہم پرستی اور لکھنے بیٹھ جاؤں بچوں کے لئے۔ الہ دین کے چراغ کا قصہ، تو کیا میں نثر لکھوں گا اور کیا کہانی بیان کروں گا تو اس زمانے میں ناشر کہانیوں کی جو کتابیں چھاپ رہے ہیں ان کی صورت یہ ہے کہ لکھنے والا ناشر کی فرمائش پر بچوں کے لئے آسان زبان میں کسی پرانی کہانی کو بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے وہ نہ تو خود واردات کے طور پر بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طور پر لکھی ہوئی کہانی سے بچہ کو سندباد جہازی کا قصہ تو معلوم ہو جاتا ہے مگر وہ سندباد جہازی کے ساتھ اجنبی جزیروں کا سفر نہیں کرتا۔

یہ تو ہوئی بنیادی بات۔ اب میں کچھ ضمنی باتیں کر دوں گا۔ ایک بات تو یہ ہے

itsurdu.blogspot.com

کہ بچوں کے لئے بے شک سلیس و سادہ زبان لکھنی چاہیئے۔ مگر اس کا مطلب نہ تو استعاروں کا اخراج ہونا چاہیئے کہ بچوں کی لغت محدود اور مختصر رہ جائے۔ بچوں کے ہاں فہم کا ذریعہ عقل سے زیادہ تخیل ہوتا ہے اور تخیل استعارے کی زبان زیادہ سمجھتا ہے۔

دوسری بات لہجے سے متعلق ہے۔ کہانی بچوں کے لئے ہو یا بڑوں کے لئے وہ جیتا جاگتا تجربہ تو اسی وقت بنتی ہے جب اس نے کتابی زبان سے چھٹکارا پالیا ہو اور بول چال کے لہجوں کو اپنایا گیا ہو۔ بول چال کے لہجوں کا معاملہ اردو کے ساتھ تقسیم کے بعد کسی قدر مشکل اور پیچیدہ ہو گیا ہے اس لئے کہ اُردو کے وہ لہجے جو دلّی اور لکھنؤ میں بنے سنورے تھے روز بروز متروک ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ مگر کچھ نئے لہجے بھی تو پیدا ہو رہے ہوں گے۔ کیا آج بچوں کی کہانی لکھنے والے کے لئے یہ سمجھنا ضروری نہ ہو گا کہ اب پنجابی یا کسی دوسری علاقائی زبان کے اثر سے کون سے نئے لہجے زبان میں در آئے ہیں۔ ہاں ایک بات میں اور کہوں گا۔ نئی اردو پنجابی سے اتنی قریب نہیں ہے جتنی پرانی اردو ہے اردو کی داستانیں پڑھتے ہوئے ہم ایسے بہت سے لفظوں سے روشناس ہوتے ہیں۔ جو اب اردو میں متروک ہیں، مگر پنجابی بول چال میں زندہ ہیں۔

ہم زبان کے بدلتے ہوئے لہجوں کو اور ساتھ ہی پرانی اُردو کے اس پہلو کو نظر میں رکھیں تو کیا بچوں کے لئے ایسی زبان نہیں لکھ سکتے ہیں جو کتابی نہ ہو بلکہ آج کل کے روزمرہ سے بھی جس کا ربط ہو اور اردو کی روایت سے بھی اس کا رشتہ استوار ہو۔

بچوں میں مطالعہ کی عادات

محمد مرزا

مطالعہ اور قرأت میں انہماک اور مسلسل و گہرا شغف نہ صرف تعلیم و تدریس کے بنیادی مقاصد کا ایک اہم حصہ ہے بلکہ انسان کے شخصی ارتقا کی اہم ضرورت ہے۔ انسانی زندگی میں ذاتی تجربات بہت اہم کردار انجام دیتے ہیں اور ان میں تجربات کی بنا پر فرد اپنے ماحول کا فہم حاصل کرنے اور اس پر قدرت حاصل کرنے، تسخیر کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ تاہم وہ ہر تجربہ خود کرنے اور اس تجربہ سے حاصل شدہ معلومات سے استفادہ کرنے کے لئے تمام تر توانائیاں اور وقت نہیں رکھتا۔ وہ اس سلسلے میں دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ افراد کی اس خواہش نے ابلاغ کے مختلف ذرائع کو جنم دیا۔ دوسروں کے تجربوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنے ذاتی تجربات کو بھی دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کی۔ تاکہ تمام افراد مل جل کر اپنے ماحول، اپنے حالات اور اپنی زندگی کو پُر مسرت و خوشگوار بنا سکیں۔ یہی وہ جذبہ تھا جس نے زبان و بیان کے مختلف اسالیب کو ہیئت بخشی۔

ادب بھی انسان کی اس خواہش کی علامت اور اس کی مجموعی زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہے۔ ادب، زندگی کو مختلف پہلوؤں سے دیکھنے اور سمجھنے کی ایک بھرپور کوشش ہے مطالعہ ادب، زندگی کے بارے میں مختلف پہلوؤں اور متنوع انداز سے بیان کردہ تجربات سے استفادہ کا نام ہے۔

مطالعہ اور خصوصاً ایسا مطالعہ جو آزادانہ طور پر کیا جائے۔ انسان کی ذاتی خواہش دلچسپی، ضرورت اور پیش آمدہ مسائل سے متعلق ہے۔ کامیاب اور آزاد، تفریحی اور ذاتی مطالعہ کے لئے خواہش و چاہت انسان کے اندر سے ابھرتی ہے۔ تاہم کسی بھی قسم کے مطالعہ کے لئے بنیادی شرط مطالعہ کی وہ مہارتیں ہیں جن کا تعلق حروف، الفاظ، زبان کی ساخت

itsurdu.blogspot.com

اسلوب بیان اور ادب کی ہیئت و کی پہچان سے ہے اگر فرد پڑھنا جانتا ہے تو اس کو کتاب کی طرف مائل کرنا نسبتاً آسان ہوگا۔ اس کے بعد یقیناً وہ فرد اپنی پسند اور خواہش کے مطابق مطالعہ کا میدان منتخب کرنے کے قابل ہوگا۔

اس مفروضہ کی بنیاد پر کہ لوگ پڑھنا لکھنا جانتے ہیں ہم ان کی پسند و ناپسند کی نشاندہی اور شناخت کر سکتے ہیں یا ان افراد میں مطالعہ کی دلچسپی پیدا کرنے یا اسے فروغ دینے کے سلسلے میں دو امور بڑی اہمیت کے حامل ہیں یعنی

(۱) تحریر شدہ یا مطبوعہ مواد کو پڑھنے کی مہارتیں اور

(۲) اس مواد کا فرد کی ضرورت، دلچسپی اور مسائل سے متعلق ہونا۔

پہلا وظیفہ یقیناً تعلیمی ادارے انجام دیتے ہیں، وہ افراد میں حروف، الفاظ، جملوں اور عبارت کی شناخت اور ان کے معانی و مطالب اور مفاہیم کو سمجھنے کی صلاحیت و مہارت پیدا کرتے ہیں۔ اس صلاحیت و مہارت کی بنیاد پر افراد مختلف النوع مطالعاتی مواد کو پڑھ کر اس سے معانی اخذ کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ تاہم دوسرا امر بیک وقت چار معاشرتی اداروں سے متعلق ہے۔ یعنی اساتذہ (یا تعلیمی ادارے) والدین، مصنفین اور ناشرین ان اداروں کا کام یہ ہے کہ وہ اولاً افراد کی ضرورتوں، دلچسپیوں اور مسائل کی شناخت کریں۔ دوم ان ضرورتوں دلچسپیوں اور مسائل کے مطابق مطالعاتی مواد فراہم کریں اور سوم یہ کہ وہ افراد کی ضرورتوں، دلچسپیوں اور مسائل میں تنوع، تبدیلی پیدا کریں اور انہیں دوسرے افراد کے مسائل، دلچسپیوں اور ضرورتوں سے واقف و روشناس کریں۔ اس سلسلہ میں ان اداروں کو دہرا فریضہ انجام دینا پڑتا ہے۔ یعنی وہ قارئین کو نہ صرف کسی ذاتی ضرورتوں اور دلچسپیوں تک محدود رکھتے ہیں۔ بلکہ انہیں زندگی کے مختلف پہلوؤں سے اس انداز سے متعارف کراتے ہیں کہ ان کی ضرورتوں اور دلچسپیوں کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے ان میں وسعت نظر پیدا ہو جاتی ہے اور وہ محدود سے لامحدود کی وسعتوں میں غوطہ زن ہو کر زندگی کے معانی سے واقف ہو جاتا ہے۔

بچے بھی اس متحرک و فعال زندگی کا ایک جزو لاینفک ہیں اور ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم انہیں زندگی کے مختلف پہلوؤں سے بھرپور انداز میں روشناس کرائیں۔ ظاہر ہے

کہ انہیں یہ علم، یہ واقفیت، یہ عرفان، مطالعہ کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم بچوں میں مطالعہ کی مناسب عادات پیدا کریں۔ بچے بالغوں سے اس صورت میں قطعاً مختلف ہیں کہ ان میں دلچسپیوں اور ضرورتوں کا محور و محرک خود ان کی اپنی ذات ہوتی ہے، وہ بالغوں کے مقاصد اور تجربات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ وہ صرف تفریح طبع اور خوشی و مسرت کے لئے کوئی کام کرتے ہیں۔ خواہ وہ مطالعہ ہی کیوں نہ ہو، تاہم اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ انہیں زندگی کے گوناگوں مسائل سے بے خبر رکھا جائے انہیں اسی تفریح و مسرت کے ذریعہ زندگی سے واقف کرانا ہوگا۔ مطالعہ کتب بچوں کو ایسے مواقع فراہم کرے گا جس کے ذریعہ انہیں تفریح کا سامان بھی میسر آ سکے اور انہیں زندگی کے مسائل کی واقفیت بھی حاصل ہو سکے۔

اس وقت ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ بچے کی دلچسپیاں اور ضرورتیں کیا ہو سکتی ہیں ان کے مطابق کیا مطالعاتی مواد مناسب ہوگا اور بچوں میں مطالعہ کی دلچسپیوں کو کیسے فروغ دیا جا سکتا ہے۔ ناشرین یا اشاعتی ادارے اس سلسلے میں کیا کردار انجام دیتے ہیں:

بچے مطالعہ کیوں کریں؟

اس سے قبل کہ ہم بچوں کی مطالعاتی دلچسپیوں کی بات کریں یہ بات ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مطالعہ کے مقاصد کی نشاندہی کر لی جائے تاکہ موضوعات، دلچسپیوں اور ضرورتوں کے تناظر میں ہم طے کر سکیں کہ ہمیں کس قسم کا مطالعاتی مواد درکار ہے اور اسے شائع کرنا چاہیئے مطالعہ کے عام طور پر یہ مقاصد ہو سکتے ہیں:

۱۔ فارغ اوقات کو مناسب انداز میں صرف کرنے کے لئے مطالعہ کرنا مختلف تفریحات کے ساتھ مطالعہ بچوں کو موزوں اور صحت مند انداز میں فارغ اوقات صرف کرنے کے مواقع فراہم کرنا۔

۲۔ مطالعہ ادب بچوں میں وسعت نظر پیدا کرتا ہے۔ دوسرے ذرائع ابلاغ کے

itsurdu.blogspot.com

مقابلہ میں کتاب درد کو ممکنات و حالات اور زندگی کے معانی سمجھنے میں زیادہ معاون و مددگار ہوتی ہے۔

۳۔ مطالعہ بچوں کی دلچسپیوں میں وسعت و تنوع پیدا کرنے کا اہم ترین ذریعہ ہے اس کے ذریعہ بچے کی دلچسپیاں تبدیل ہوتی ہیں اور وہ نئے امور و مسائل کی طرف رجوع کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

۴۔ مطالعہ سے بچے کے تجربات میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور غیر ذاتی (یا دوسروں) تجربات سے روشناس ہوتا ہے۔

۵۔ مطالعہ کے ذریعہ بچوں میں جمالیاتی حس بیدار ہوتی ہے وہ مطالعہ کتب کے ذریعہ اچھی اور بری جمالیاتی اقدار میں تمیز کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

۶۔ بچے مطالعہ کے ذریعہ خود شناسی کے ساتھ ساتھ دوسرے افراد سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ مطالعہ انہیں مختلف افراد کو پیش آنے والے مسائل سے روشناس کرتا ہے اور اس بنا پر ان میں یہ احساس بیدار ہوتا ہے کہ مسائل سے صرف وہ خود ہی نبرد آزما نہیں ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اس قسم کے مسائل و حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس طرح خود ان میں مسائل کی شناخت اور ان سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت نشوونما پاتی ہے۔

۷۔ مطالعہ بچوں میں اخلاقی و معاشرتی اقدار کا گہرا احساس ترقی دینے میں مدد و معاون ہوتا ہے ادب بچے میں تیقن، تجسس، زندہ رہنے کا جذبہ، جرأت و توانائی، خیر و شر میں تمیز، صلح جوئی و عافیت اور دیگر پسندیدہ رویے بیدار کرتا ہے۔

مطالعہ کی اس اہمیت کے پیش نظر ضروری ہے کہ ہم اپنے بچوں میں زیادہ سے زیادہ مطالعہ کی عادات کو فروغ دیں۔ بچوں کی دلچسپیوں میں اضافہ کریں انہیں مطالعہ کے لئے اچھا ادب فراہم کریں ان کی ضرورتوں اور دلچسپیوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اور ان کی نشوونما کے مدارج کو پیش نظر رکھتے ہوئے موزوں، مناسب اور خوبصورت کتابیں شائع کیں۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ بچوں کی عمومی ضرورتیں اور دلچسپیاں کیا ہیں؟ اور ان سے

مطالعہ کی عادات کے فروغ میں کس طرح کام لیا جا سکتا ہے۔

بچوں کی مطالعاتی دلچسپیاں

بچوں میں مطالعہ کی عادات کو فروغ دینے کے سلسلے میں ان کی مطالعاتی دلچسپیاں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں بچوں میں کتاب اور مطالعہ سے شغف پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے مطالعہ کی دلچسپیوں کا جائزہ لیا جائے۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ بچوں میں مطالعہ کی عادات کو اس وقت فروغ دیا جا سکتا ہے جب انھیں ان کتب کے پڑھنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کئے جائیں، جن کے پڑھنے میں وہ دلچسپی رکھتے ہیں یا دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔

ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ دلچسپی بچے کے کردار کے لئے بیج کا کام انجام دیتی ہے اور اس کی بنیاد پر خواہش میں اضافہ یا کمی کی جا سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دلچسپی انسان کے کردار کی مناسب اصلاح، ترمیم یا یکسر تبدیلی میں بہتر کارکردار ادا کرتی ہے اور بچے بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ اس مقام پر یہ بات بھی بڑی اہم ہے کہ بالغوں کے برعکس اگر بچے کی دلچسپیوں اور اس کی خواہشات کو نظر انداز کر کے اسے کسی خاص کام یا مطالعہ پر مجبور کیا جائے تو وہ محرومی و شکست کا شکار ہو جائیں گے اور ان میں اس کام کے بارے میں نفرت کا رویہ پیدا ہو جائے گا۔ تاہم یہ بات بھی جاننا ضروری ہے کہ دلچسپیاں، کوئی مستقل چیز نہیں ہیں اور وقت، حالات اور عمر (خصوصاً ذہنی عمر) کے لحاظ سے ان میں تبدیلی ممکن ہے بعض اوقات بچے اپنے ساتھیوں اور ہم عمروں کی دیکھا دیکھی اپنی دلچسپیاں تبدیل کر لیتے ہیں۔ بعض صورتوں میں یہ بھی ممکن ہے کہ ایسے حالات پیدا کر دیئے جائیں کہ وہ اپنی موجودہ دلچسپیوں کے مقابلہ میں نئے امور کی طرف راغب ہو جائیں۔ بہرحال ایک حد تک بچوں کی دلچسپیاں، اپنی عمر کے اعتبار سے ایک خاص درجہ نمو (GROWTH) پر خاص دیر پا ہوتی ہیں اور اس اعتبار سے ان کے مطالعہ کی دلچسپیوں (یا رجحانات) کا بڑی حد تک تعین بھی ممکن ہے۔

itsurdu.blogspot.com

اس امر کے اظہار میں قطعاً کوئی شبہ نہیں، بلکہ افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں کم از کم میرے ناقص علم کے مطابق، کوئی ایسا مطالعہ یا تحقیق نہیں کی گئی جس کی بنیاد پر ہمیں یہ معلوم ہو سکے کہ نشوونما کے مختلف مدارج پر بچوں کی عمومی دلچسپیاں اور خصوصاً مطالعاتی دلچسپیاں کیا ہیں؟ نیشنل بک کونسل نے مطالعہ کی عادات کے فروغ کے سلسلے میں یقیناً کچھ کام کیا ہے۔ تاہم اس کا محور بھی بچے نہیں ہیں۔ کونسل نے بچوں کی کتب کے انڈکس یا فہرستیں شائع کی ہیں جس سے بچوں کے ادب اور مطالعہ میں اس کی دلچسپی کا اظہار ضرور ہوتا ہے۔ بہرطور اس سلسلہ میں ناشرین نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی ہے۔ تعلیمی حلقوں میں اس کام کی خواہش ضرور پائی جاتی ہے۔ تاہم وسائل کی کمی کی بنا پر یہ حلقے اس کام کا بیڑا نہیں اٹھا سکے۔ دیگر ممالک خصوصاً امریکہ و برطانیہ میں اس میدان میں کافی تحقیقی کام ہوا ہے۔

بچے خواہ کسی ملک کے ہوں، ان کی دلچسپیاں نسبتاً ملتی جلتی ہوتی ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ میں جو تحقیقات کی گئی ہیں (اور اتفاق کی بات ہے کہ ہمارے کچھ ماہرین بھی ان میں شامل ہیں) ان کی بنیاد پر ہم چند تعمیمات GENERALIZATION قائم کر سکتے ہیں تاہم ان کو کلی طور پر اپنے بچوں اور اپنے ماحول پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔ اس میدان میں ہمیں خود ہی تحقیق و مطالعہ کر کے بچوں کی مطالعہ کی دلچسپیوں کا تعین کرنا ہوگا جو تحقیقات اب تک ہوئی ہیں ان کی روشنی میں یہ نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں کہ

۱۔ بچوں کی دلچسپیاں عمر اور تعلیمی سطح کے مطابق تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔

۲۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی دلچسپیوں میں نو سال کی عمر تک بہت کم فرق پائے جاتے ہیں۔

۳۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی دلچسپیوں میں ۱۰ سے ۱۳ سال کی عمر تک (خصوصاً ۱۲ سال کی عمر میں) نمایاں فرق پائے جاتے ہیں۔

۴۔ لڑکیاں اور لڑکوں کے مقابلے میں زیادہ مطالعہ کرتی ہیں۔

۵۔ لڑکوں کی مطالعہ کی دلچسپیوں کا دائرہ (بلحاظ موضوعات) لڑکیوں کے مقابلے

میں زیادہ وسیع ہوتا ہے وہ مختلف اقسام کے مواد کا مطالعہ کرتے ہیں۔

۶۔ رومانی افسانوی ادب کا لڑکیاں، لڑکوں کے مقابلے میں زیادہ اور جلد دلچسپی لینا شروع کر دیتی ہیں (خصوصاً ۱۴/۱۳ سال کی عمر میں)

۷۔ لڑکے عموماً ایسی کتاب میں دلچسپی لیتے ہیں جن میں مہم جوئی THRIL جبکہ لڑکیاں افسانہ، ادب زیادہ دلچسپی سے پڑھتی ہیں۔ تاہم پراسرار واقعات (MYSTERIES) میں ہی دلچسپی کا اظہار کرتی ہیں۔

مزید تحقیقات سے یہ بات بھی منظر عام پر آئی کہ

۹۔ ذہانت مطالعہ کی صلاحیت، معاشرتی و اقتصادی عوامل مطالعہ کے انتخاب پر بہت کم اثر انداز ہوتے ہیں۔ تاہم اور عمر کے اثرات اکثر نمایاں ہوتے ہیں۔

ان عمومی نتائج کے علاوہ بچوں کی نشوونما کے مختلف درجات کے مطالعہ کی دلچسپیوں کے تعین کی خاطر بھی تحقیقات کی گئیں۔ ان تحقیقات کے نتائج کے مطابق بچوں میں ان مطالعاتی دلچسپیوں کی نشاندھی کی گئی ہے۔

(الف) پانچ سے سات سال کی عمر کے بچوں کی دلچسپیاں

اس عمر کے بچے اس قسم کی کہانیوں اور مواد میں دلچسپی لیتے ہیں:

(۱) کہانیاں، کارٹون (۲) کی کہانیاں (۳) تمثیلی یا بناوٹی اور پریوں کی کہانیاں (۴) مزاحیہ کہانیاں (۵) پرندوں کی کہانیاں۔ (۶) گھر، بچوں، کھیلوں اور روزمرہ سرگرمیوں کے بارے میں سچی کہانیاں۔ (۷) مختلف اشیاء مثلاً کاروں، ٹرکوں، جہازوں، ہوائی جہازوں اور دیگر ایجادات وغیرہ کے بارے میں معلوماتی کہانیاں۔ (۸) مہمات کی کہانیاں (۹) ہیروز کی کہانیاں۔

اس عمر میں بچے کہانیوں کے ساتھ ساتھ تصاویر بہت پسند کرتے ہیں۔ مختلف قسم

itsurdu.blogspot.com

کے شوخ رنگوں پر زیادہ متوجہ ہوتے ہیں۔ رنگ دار چیزوں اور کتابوں کو بڑے شوق سے الٹ پلٹ کر دیکھنے میں لطف محسوس کرتے ہیں۔ بہت مختصر (یعنی چند جملوں پر مشتمل) کہانی ہی پڑھ سکتے ہیں۔ ابتداً صرف تصویری کہانیاں پسند کرتے ہیں۔ سات سال کی عمر تک پہنچتے ہوئے معلوماتی کہانیاں پڑھنے کی طرف راغب ہو جاتے ہیں تاہم ہر کہانی کے ساتھ رنگ برنگی تصویروں کا اظہار کرتے ہیں۔

(ب) آٹھ سے دس سال کی عمر کے بچوں کی دلچسپیاں

ان عمروں کے بچے اس قسم کی کتب میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں:

(۱) جادوئی کہانیاں (۲) پریوں اور دیووں کی کہانیاں
(۳) خیالی تمثیلی کہانیاں (۴) لوک کہانیاں
(۵) اخلاقی کہانیاں PARABLES (۶) مہمات کی کہانیاں
(۷) جاسوسی کہانیاں (۸) پر اسرار کہانیاں
(۹) ٹاولٹ (۱۰) مزاحیہ کہانیاں
(۱۱) سوانح عمریاں (۱۲) سائنس کہانیاں
(۱۳) سچے واقعات پر مبنی کہانیاں
(۱۴) مظاہر فطرت، ایجادات سائنس، کھیل کود، گھریلو زندگی، مقامات، ممالک وغیرہ پر مبنی معلوماتی کتب۔

اس عمر میں لڑکوں اور لڑکیوں کی دلچسپیوں میں کچھ فرق ظاہر ہونا شروع ہو جاتا ہے لڑکے عموماً ایسی کتب پسند کرتے ہیں جن میں حرکت، سرگرمی، مہم جوئی اور جنگ جوئی، جرأت نمایاں ہو، لڑکے دس سال کی عمر تک پہنچنے پر کچھ پیشہ ورانہ دلچسپیوں کا اظہار کرتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے وہ ایسی کتب میں بھی دلچسپی لینے لگتے ہیں جو معلومات پر مبنی ہوتی ہیں اس وقت ان میں "کچھ بننے" کی خواہش بھی پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ عظیم لوگوں کی سوانح عمریوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ جبکہ لڑکیوں میں خیالی کہانیوں کے مطالعہ میں دلچسپی برقرار

رہتی ہے۔ تاہم دس سال کی عمر پر پہنچ کر ان میں رومانس اور عائلی زندگی کا احساس بیدار ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

اس عمر میں اور اس کے بعد بھی لڑکیوں میں افسانوی اور گھریلو زندگی سے متعلق ادبی کتابیں پڑھنے کا شرف اجاگر ہوتا ہے۔ لڑکے، لڑکیوں سے متعلق کتب میں دلچسپی نہیں لیتے، تاہم لڑکیاں وہ کتابیں بھی پڑھنے میں دلچسپی لیتی ہیں جو صرف لڑکوں کے لئے لکھی گئی ہوں۔ عمر کے اس حصے میں بچوں میں دلچسپیاں بھی برقرار رہتی ہیں جو ۵ سے ۷ سال کی عمر تک کے بچوں میں موجود ہیں۔

اس عمر کے بچے سادہ جملوں میں بیان کردہ کہانیوں سے مطالعہ شروع کرتے ہیں۔ دس سال کی عمر تک پہنچنے پر وہ مرکب جملے بھی سمجھنے لگتے ہیں تاہم پیچیدہ جملوں پر مشتمل عبارت سے انھیں قدرے الجھن ہوتی ہے وہ ایسی عبارت سے بوریت محسوس کرتے ہیں ان کی توجہ کا دائرہ خاصا وسیع ہو جاتا ہے اور وہ دلچسپ انداز میں تحریر شدہ کتاب کو مکمل کئے بغیر نہیں چھوڑتے۔ اس عمر میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنی توجہ کو خاصے طویل عرصے تک مرکوز رکھنے کے قابل ہوتے ہیں وہ کہانی یا کتاب میں ایک پلاٹ تلاش کرتے ہیں اور ایسی کتابیں پسند کرتے ہیں جن میں واقعات کا ایک مربوط سلسلہ موجود ہو۔

(ج) گیارہ سے چودہ سال کی عمر کے بچوں کی دلچسپیاں

اس عمر کے بچوں میں گزشتہ دور کی مطالعاتی دلچسپیاں برقرار رہتی ہیں۔ تاہم کے اعتبار سے کچھ نمایاں تبدیلی نظر آنے لگتی ہیں۔ لڑکوں میں مہم جوئی، جرأت، جوانمردی عظیم لوگ، عظیم کارناموں، انکشافات اور سائنس پر مبنی مواد سے دلچسپی بڑھ جاتی ہے وہ حیرت انگیز واقعات اور جاسوسی کہانیوں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں اس کے برعکس لڑکیاں مطالعہ میں لڑکوں کے مقابلے میں زیادہ دلچسپی کا اظہار کرتی ہیں۔ تاہم ان کی دلچسپی کا محور رومانس اور افسانوی ادب اور معاشرتی، عائلی امور پر مبنی کہانیوں میں

itsurdu.blogspot.com

دلچسپی آخر عمر تک برقرار رہتی ہیں۔

مختلف مدارج نشوونما پر بچوں میں عموماً یہی دلچسپیاں موجود ہوتی ہیں ان عمومی دلچسپیوں کے باوجود ان کی مطالعاتی دلچسپیوں میں انفرادی اختلافات بھی پائے جاتے ہیں۔ مطالعہ کے سلسلے میں ہر فرد کا خاص پسندیدہ موضوع بھی ہو سکتا ہے۔ بچوں کے مطالعہ کی دلچسپیوں پر ذاتی، گھریلو، معاشرتی، تعلیمی، تہذیبی عوامل اثر انداز ہوتے ہیں ان عوامل میں اگر ناشرین کو شامل کر لیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کیوں کہ مطالعاتی مواد کی اشاعت اور مارکیٹ میں ان کی فراہمی انہیں کے اختیار میں ہے اور وہ بچوں اور بالغوں کی دلچسپیوں پر گہرے اثرات ثبت کرتے ہیں اس سلسلے میں چند امور کی نشان دہی یقیناً ہمارے لئے مفید ہوگی۔

۱۔ دلچسپیاں، دوسرے امور کی طرح آموختہ ہوتی ہیں اور انہیں تربیت، تعلیم اور ابلاغ کے ذریعے تبدیل کیا جا سکتا ہے یا مؤخر مقدم کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ بچوں کے کسی بھی گروہ میں دلچسپی میں اختلافات ہو سکتے ہیں اور ان دلچسپیوں کی شناخت کے بعد ماحول اور حالات (یا محرکات) میں تبدیلی و اصلاح کے ذریعے بچوں میں موجود اختلافات کو کم کیا جا سکتا ہے اور یکساں دلچسپیاں اجاری جا سکتی ہیں۔

۳۔ مطالعہ کی دلچسپیوں اور زندگی کی دیگر دلچسپیوں میں باہم ربط ہوتا ہے۔ زندگی کی کسی ایک دلچسپی سے متعلق مطالعاتی مواد فراہم کر کے بچوں کو مطالعہ میں دلچسپی لینے کے لئے تیار کیا جا سکتا ہے کسی دلچسپ کہانی یا معلوماتی کتاب کے مطالعہ کے بعد بچے مزید مطالعہ میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔

۴۔ بچوں میں مطالعہ کی دلچسپی پیدا کرنے اور اسے برقرار رکھنے میں والدین اور معلم بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ناشرین بھی معلم کا کردار انجام دے سکتے ہیں اور وہ بچوں کو مطالعہ کے لئے تیار کر سکتے ہیں۔

۵۔ کتاب کا عنوان اور ظاہری حسن بھی بچوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور مطالعہ

پر آمادہ کر سکتا ہے کیونکہ پہلی بار یہی ظاہری کیفیت بچوں کے سامنے آتی ہے اور وہ اسی کو دیکھ کر اس کے مطالعہ پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

کتاب کی خوبیاں جو دلچسپی میں اضافہ کا باعث ہو سکتی ہیں

بچوں کی مطالعاتی دلچسپی کے ساتھ ساتھ مطالعاتی مواد یا کتاب کی کچھ خوبیاں ایسی ہوتی ہیں جو بچوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہیں۔ ان خوبیوں کو کہانی یا مواد کے پلاٹ، موضوع (یا تھیم) کردار نگاری، زبان و بیان اور اسلوب نگارش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ بچوں کی دلچسپی اور ان کے ذہنی و جذباتی (یا ذاتی) خصائص کے مطابق مطالعاتی مواد یا کتاب میں کچھ امور کو مدنظر رکھنا مفید ہو گیا۔

(الف) پلاٹ

بچوں کی عمر کو مدنظر رکھتے ہوئے ابتداً پلاٹ سادہ اور MATTER OF FACT قسم کا ہونا چاہیئے۔ چودہ سال کی عمر پر پیچیدہ پلاٹ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے پلاٹ خواہ سادہ ہو یا پیچیدہ بہرحال وہ متحرک زندگی سے بھرپور ہو، اس میں واقعات اور عمل مربوط ہوں۔ واقعات قابل یقین اور نظر آئیں۔ مناظر کو صحت اور فصاحت سے بیان کیا جائے، کہانی کا ماحول متعلقہ تہذیب کی عکاسی کرتا ہو اور کہانی میں تعجب سسپنس اور جوش موجود ہو تاکہ بچوں کی دلچسپی مسلسل برقرار رہے۔

(ب) موضوع (یا تھیم)

مواد یا کہانی میں ایک یا زیادہ سے زیادہ تو موضوعات ہوں۔ لیکن یہ موضوع اس انداز سے پیش کیا جائے کہ وہ کہانی سے خود بخود ابھرے۔ ایسا نہ ہو کہ کہانی یا مواد واضح طور پر ایک اخلاقی نظر آئے اور اس کے کردار تبلیغ کرتے ہوئے معلوم ہوں یا جس میں عبارت سے یہ محسوس ہونے لگے کہ مصنف کہانی سنانے یا معلومات پیش کرنے کے بجائے بچوں کو نصیحتیں کر رہا ہے۔ کردار، واقعات اور

itsurdu.blogspot.com

مواد کا ماحول بچوں کو ان مخصوص نتائج تک پہنچنے میں مدد دیں۔ جن سے مصنف روشناس کرانا چاہتا ہے۔

ج : کردار نگاری :

پلاٹ اور کردار نگاری میں بہت ہی گہرا ربط ہوتا ہے اس لئے پلاٹ اور کردار میں مناسبت ہونا ضروری ہے۔ واقعات کردار کی رہنمائی کریں اور کردار واقعات کے بنانے اور ابھارنے میں معاون ہوں۔ بچے ایسے کرداروں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ جو انسانوں کی طرح رہتے بستے اور چلتے پھرتے ہیں۔ یہ بات دیو مالائی اور جن پریوں کی کہانیوں پر بھی ہوتی ہے۔ کرداروں میں زندگی نظر آنا چاہیئے وہ ایسی گفت گو کرتے ہیں جو ان کے کرداروں کے مطابق ہو۔ مکالمے ایسے ہوں جو کہانی کو متحرک رکھنے میں معاون ہوں۔ ان کی گفت گو میں اتار چڑھاؤ ہو۔ وہ ایسی زبان بولتے نظر آئیں جو ان کے ماحول، حالات اور عمر سے مطابقت رکھتے ہوں۔ بچے ایسے کردار اور مکالمہ پسند نہیں کرتے جو اصلی اور کے مقابلے میں خیالی اور بناوٹی ہوں۔

۵ : زبان و بیان

زبان و بیان صحیح ہونا چاہیئے۔ بچے اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ کہانی کے کردار (یا مصنفین بعض باتوں کی وضاحت کے لئے) بچوں کی غلط زبان میں گفت گو کریں جملے سادہ اور آسان ہوں اور واقعات و کردار کی مناسبت سے الفاظ استعمال کئے جائیں۔ بچوں کو زبان اور پیچیدہ و مرکب جملوں سے بوریت محسوس ہوتی ہے۔ الفاظ میں آہنگ اور حسن موجود ہو۔ بہرحال یہ مشکل الفاظ نہیں ہونا چاہئیں۔ طویل جملے بچوں کو تھکا دیتے ہیں اس لئے چھوٹے چھوٹے جملوں میں بات کہی جائے۔

س : اسلوب نگارش

اسلوب نگارش مصنف کی ذات اور زبان و بیان پر قدرت سے تعلق رکھتا ہے اس لئے ہر مصنف کے اسلوب میں یقیناً فرق ہوگا۔ بچوں کو فطری انداز پسند ہوتا ہے۔ اس لئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ وہ کردار و واقعات کے مطابق کہانی یا مضمون

کو ضبط تحریر میں لائے۔ زبان میں روانی ہو۔ الفاظ اور جملوں کے بے جا تکرار کی ہر بات نہایت وضاحت، صفائی اور جوش و جذبے سے بیان کی جائے جو بچے کی کہانی کے ساتھ متحرک رہنے پر آمادہ کرے۔ بہرکیف بچے کی عمر اور زبان پر اس بچے کی قدرت اسلوب کا تعین کرے گی۔ پانچ سال کے بچے سے گفت گو کا وہ انداز اختیار نہیں کیا جاسکتا جو ۱۴/۱۵ سال کے بچے کے لئے سمجھنا ممکن ہو۔

۶ : لغزشیں :

پلاٹ موزوں ہو۔ موضوع بھی مناسب ہو۔ کردار بھی اچھے ہوں اور زبان و بیان بھی بچوں کی عمر سے مطابقت رکھتی ہو۔ اس کے باوجود مصنفین سے بعض ایسی لغزشیں بھی سرزد ہو جاتی ہیں جن کی بنا پر بچے پہلی ہی کتاب پڑھنے کے بعد مطالعہ سے گریز کرنے لگتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ابھی اپنی درسی کتاب کے علاوہ کوئی کتاب پڑھنے اور اس کے مواد کو سمجھنے کے قابل نہیں ہیں وہ لغزشیں کچھ ایسی ہو سکتی ہیں :

۱۔ مواد یا کہانی میں بے انتہا مبالغہ آمیزی سے کام لیا جائے۔

۲۔ کتاب سے معلومات کی بھرمار ہو یا واقعات سے ہر بات کو بڑی ہی فصاحت سے بیان کیا جائے اور بچے کے تخیل پر کچھ بھی نہ چھوڑا جائے۔

۳۔ معلومات کو مبلغانہ انداز میں پیش کیا جائے۔

۴۔ کہانی اور واقعات کا ٹیمپو اس قدر سست ہو کہ بچے کو اکتاہٹ اور بوریت محسوس ہونے لگے یا رفتار اس قدر تیز ہو کہ بچہ کا فہم اور تخیل واقعات کے تسلسل کا ساتھ نہ دے سکے۔

۵۔ واقعات و حالات کو (خصوصاً) کم عمر بچوں کے سلسلہ میں) اس انداز سے پیش نہ کیا جائے کہ بچوں پر خوف اور کپکپی کی کیفیت طاری ہو جائے یا وہ شدید غم و اندوہ کا شکار ہو جائیں۔

ایسی کتابیں جن میں ان لغزشوں سے گریز نہ کیا گیا ہو بچوں کو مطالعہ سے دور کرتی ہیں۔ یعنی بچوں میں مطالعہ سے نفرت کے جذبات ابھار دیتی ہیں۔ مطالعہ

itsurdu.blogspot.com

میں بچوں کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان میں ایسا مطالعاتی مواد مہیا کیا جائے جو انھیں بتدریج زیادہ سے زیادہ مطالعہ کی ترغیب دے۔ چھوٹے بچوں کی توجہ کی مدت بہت مختصر ہوتی ہے اس لئے وہ صرف ان کہانیوں یا مواد میں دلچسپی لیتے ہیں جن میں صحیح واقعات خوبصورت انداز میں پیش کئے گئے ہیں لہٰذا مصنف کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ باقاعدہ منصوبہ تیار کرکے مواد مرتب کرے اور اس سلسلے میں بچوں کی دلچسپیوں اور کتاب کی ضروری خوبیوں کا خیال رکھے۔

مطالعہ کی عادات کا فروغ

ہم بچوں میں مطالعہ کی عادات کو کیسے ترقی دے سکتے ہیں؟ یہ سوال بڑا اہم اور پیچیدہ ہے، اس کا دو ٹوک جواب اس ناچیز کے بس میں نہیں ہے یہاں صرف ان چند عوامل کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جو بچوں میں مطالعہ کی عادات کے فروغ میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ان اقدامات کی جانب اشارہ بھی کیا جاسکتا ہے جو بچوں کو مطالعہ میں دلچسپی لینے پر آمادہ کرسکتے ہیں وہ عوامل و اقدامات یہ ہوسکتے ہیں:

(الف) ٹیلی ویژن

ایسا ایک ذریعہ ابلاغ ہے جو بچوں کی بیشتر توجہ کو اپنی جانب ملتفت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ٹیلی ویژن نے بچوں کی مطالعہ میں دلچسپی کو بڑی حد تک کم کردیا ہے۔ یہ بات کہاں تک درست ہے اس پر ترقی یافتہ ممالک میں کافی تحقیقات ہورہی ہیں۔ جو تحقیقات اب تک منظر عام پر آئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچ سال کی عمر تک کے بچے ٹیلیویژن دیکھنے میں دن بھر کا ۱/۳ حصہ صرف کرتے ہیں۔ کنڈر گارٹن (یعنی ۵ سے ۶ سال کی عمر کے بچے بھی بڑا وقت ٹیلی ویژن دیکھنے میں صرف کرتے ہیں۔ اس کے بعد ٹیلیویژن دیکھنے کی مدت میں بتدریج کمی واقع ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں یہ مسئلہ بڑا اہم ہے کہ کیا ٹیلی ویژن، مطالعہ میں رکاوٹ بنتا ہے یا اس کے فروغ کا باعث؟ اس کا حتمی جواب فی الحال ممکن نہیں ہے اس سوال کا

ممکنہ جواب بھی ہوسکتا ہے کہ ٹیلیویژن پروگرام بعض بچوں کو مطالعہ پر آمادہ کرتے ہیں جبکہ بعض بچوں کے لئے یہ رکاوٹ کا باعث بن جاتے ہیں۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ بعض بچوں نے ٹیلیویژن پر کچھ پروگرام دیکھے اور ان پروگراموں کے نتیجے میں ان میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اصل کتاب کا مطالعہ کریں یا موضوع متعلقہ کے بارے میں مزید معلومات حاصل کریں ان پروگراموں کے نتیجے میں ان بچوں میں مطالعاتی دلچسپیوں کو فروغ حاصل ہوا اس بارے میں ایک بات بڑی اہم ہے کہ والدین خاص طور پر اور معلمین عام طور پر ٹیلی ویژن پروگراموں سے متعلقہ مطالعاتی مواد یا متعلقہ کتب سے بچوں کو روشناس کرا کے ان کو مطالعہ پر آمادہ کرسکتے ہیں۔ ناشرین بھی ان پروگراموں کی بنیاد پر مطالعاتی مواد اور متعلقہ کتب سے بچوں کو روشناس کرسکتے ہیں۔

ٹیلی ویژن کی اپنی حدود اور اپنا دائرہ اثر ہے۔ ٹیلی ویژن مخصوص و محدود وقت میں بہت سے لوگوں کی دلچسپیوں کے پروگرام پیش کرتا ہے کسی ایک پروگرام میں مواد کو مکمل صحت اور پوری وضاحت تفصیل سے پیش کرنا مختصر عرصہ میں ممکن نہیں ہوتا اور ہر پروگرام ہر کی دلچسپی کا باعث بھی نہیں ہوتا۔ کجا یہ کہ بچے تمام پروگرام ذوق و شوق سے دیکھیں اس لئے یہ کہنا کہ ٹیلیویژن بچوں کے مطالعاتی ذوق و شوق میں رکاوٹ کا باعث ہے۔ کلی طور پر نہ تو صحیح ہے نہ ہی غلط۔

ناشرین، ٹیلیویژن کو بطور ایک وسیلہ بہر طور استعمال کرسکتے ہیں یا اس پر پیش کئے گئے پروگراموں سے متعلق معلومات پر مبنی مطالعاتی مواد سے دوسرے ذرائع استعمال کرکے، بچوں کو متعارف کرا سکتے ہیں۔

(ب) ابلاغ عامہ

کے دوسرے ذرائع میں بہر حال اتنی جاذبیت نہیں جو ٹیلی ویژن کو حاصل ہے۔ اخبارات، رسائل وغیرہ مطالعاتی مواد ہیں اور ان کے ذریعے بچوں میں مطالعہ کی عادات فروغ پاتی ہیں۔ رہا ریڈیو تو وہ صرف شنیدنی ہی شنیدنی ہے اور اس پر صرف گانے سنے جاسکتے ہیں۔ اپنے محدود وقت اور بہت سے افراد کی دلچسپیوں کا خیال رکھنے کے باعث بچوں کے لئے اس میں دلچسپی

itsurdu.blogspot.com

قدرے کم ہی ہوتی ہے۔ اب کیسٹ کہانیوں نے کتابوں کی جگہ لینا ضرور شروع کی ہے لیکن اپنی نیت کے لحاظ سے وہ کتاب کا مقابلہ نہیں کر سکتیں، کیونکہ وہ ہر بچے کی استطاعت اور پہنچ سے بہرحال دور ہیں۔

ان تمام ذرائع ابلاغ کے امکانی اثرات کے باوجود جو قوت کتاب میں موجود ہے وہ ان میں سے کسی کو بھی حاصل نہیں ہے لہٰذا ہمیں ان سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم بچوں کی دلچسپیوں کے مطابق مطالعاتی مواد شائع کریں اور ایسے اقدامات کریں کہ مطالعہ میں دلچسپی کو فروغ دیا جا سکے اس لحاظ سے چند ممکنہ اقدامات یہ ہو سکتے ہیں:

۱۔ بچوں کی کتابوں کو خوبصورت انداز میں شائع کیا جائے اس کی طباعت، خط اور تصاویر وغیرہ سے حسن جھلکتا نظر آئے۔

۲۔ بچوں کی کتابوں کی قیمت مقابلتاً کم ہو تاکہ اکثر بچے خرید سکیں۔ اس سلسلہ میں کئی اقدامات کئے جا سکتے ہیں مثلاً حکومت سے بچوں کی کتابوں کی طباعت و اشاعت پر ٹیکس میں چھوٹ لی جائے۔ بچوں کی کتابوں کی طباعت کے لئے جو کاغذ استعمال کیا جائے وہ کاغذ پیپر ملز نسبتاً سستا فراہم کریں۔ بچوں کی کتابوں پر منافع کی شرح کم رکھی جائے، بچوں کی کتابوں کو اصل لاگت کے مطابق فروخت کرنے کے لئے بالغوں کی کتب پر منافع کی شرح زیادہ کر دی جائے۔

۳۔ ہر سال بچوں کی کتابوں کی کانفرنس سیل کی جائے اور اس کے لئے معینہ عرصہ میں کتابیں آدھی قیمت (یا جیسا مناسب ہو) پر فروخت کی جائیں۔

۴۔ ایک سال کے دوران کتابوں کی خرید پر بچوں کے انعامی مقابلے کرائے جائیں مثلاً جو بچہ سال میں ایک مقررہ تعداد کتب خریدے۔ اسے انعام کے طور پر کچھ کتابیں مفت دی جائیں۔

۵۔ بچوں کی کتابوں کے میلے، ہفتے اور نمائشیں منعقد کی جائیں اس سلسلہ میں نیشنل بک کونسل کا تعاون حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کتاب ہفتہ کے دوران مختلف

شہروں میں کتابوں کے سٹال لگائے جائیں۔ ہفتہ کے دوران کتابیں خریدنے والے بچوں کو مختلف تحفے بھی دیئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً سٹکرز، ڈائری، نوٹ بکس، پنسلیں، بال پوائنٹ وغیرہ۔ کتاب میلے اور نمائشیں شہر یا قصبے وغیرہ کے مرکزی مقام پر منعقد کی جائیں اور اس میں انعامات و تحائف کی مقدار کتاب ہفتے کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہو سکتی ہیں۔ مثلاً کم از کم ۵۰ روپے کی کتابیں خریدنے پر انعامی کوپن دیئے جائیں۔

۶۔ اساتذہ کو بچوں کی کتابیں خریدنے پر مقابلتاً زیادہ چھوٹ دی جائے۔

۷۔ اساتذہ سے کتابوں پر تبصرے کرائے جائیں۔

۸۔ کتابوں کے بارے میں بچوں میں یا معلماتی مقابلے منعقد کرائے جائیں۔

۹۔ اساتذہ کے لئے ایسی معلماتی کتب شائع کی جائیں جو انہیں تدریس میں مدد فراہم کر سکیں۔ انہیں معلماتی کتب میں متعلقہ مضمون و موضوع سے تعلق رکھنے والی دیگر کتب کو بھی متعارف کرایا جائے جو انہیں نصاب میں تجویز کردہ سرگرمیاں مرتب کرنے میں مدد فراہم کر سکیں۔

۱۰۔ اساتذہ کے لئے ایسے سیمینار یا ورکشاپس منعقد کی جائیں، جن کے ذریعے انہیں بچوں میں مطالعہ کی دلچسپیاں پیدا کرنے کے گر سکھائے جا سکیں۔

۱۱۔ اساتذہ کے تربیتی پروگراموں میں مزید مطالعہ کی تربیت کا بندوبست کیا جائے۔

۱۲۔ ناشرین اپنی ایک ریسرچ کونسل یا کوئی ایسا ادارہ قائم کریں جو

الف: بچوں میں مطالعہ کی دلچسپیوں پر تحقیق کر کے عمر اور درجات کے اعتبار سے ان کا تعین کرے۔

ب: مختلف شہروں اور قصبوں وغیرہ کے مختلف علاقوں میں تعلیم یافتہ افراد کا تعین کر کے وہاں بک سٹال قائم کرنے کی سفارش کرے۔

ج: بچوں اور بالغوں کو نئے اور خوب صورت انداز میں مطالعہ کی اہمیت سے واقفیت دلائے اور انہیں نئی کتابوں سے متعارف کرائے۔

itsurdu.blogspot.com

د : کتابوں کی قیمتیں میں کمی کے ذرائع تلاش کرے۔

ہ : پبلک لائبریریوں اور سکولوں میں لائبریری کے استعمال پر تحقیق کرے اور ان کے بہتر استعمال کے لئے موزوں سفارشات مرتب کرے۔

آرٹ کی تعلیم

علی اختر مرزا

بچوں کی تعلیم کے سلسلہ میں دو مکاتیب خیال موجود ہیں۔ ایک کا کہنا ہے کہ بچوں کو کھیل کود کے ذریعے تعلیم دینی چاہیئے اور دوسرے کا خیال ہے آرٹ (مصوری) کو ذریعہ تعلیم ہونا چاہیئے۔ "آرٹ کے ذریعہ تعلیم" کا نظریہ مقابلتاً زیادہ مقبول ہے۔ اسی وجہ سے "چائلڈ آرٹ" کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔ وہ لوگ جو بچوں کی تعلیم اور ان کی صحت مندانہ نشوونما میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک "چائلڈ آرٹ" بچوں کی نفسیات کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر بچہ جو خطوط کھینچ سکتا ہے اور جسے پینٹ برش استعمال کرنے کا ڈھب آتا ہے وہ بڑا ہو کر ضرور کامیاب مصور بنے گا۔ ظاہر ہے کہ ہر وہ شخص جو لکھنا پڑھنا سیکھتا ہے ادیب یا مصنف نہیں بن جاتا۔ لیکن تجربہ شاہد ہے کہ بچے اپنے تجربات، احساسات اور مشاہدات کا ڈرائنگ یا پینٹ کے ذریعے اظہار کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ بچوں کی اس فطری صلاحیت کی آبیاری اور اس کی نشوونما کرنا تعلیمی نقطہ نظر سے بیحد ضروری ہے۔

بچپن میں الفاظ کا ذخیرہ محدود ہوتا ہے۔ زبان پر پوری طرح حاوی نہ ہونے کی وجہ سے بچے الفاظ میں اپنے خیالات اور جذبات کو اچھی طرح ادا نہیں کر سکتے لیکن آرٹ (ڈرائنگ، پینٹنگ، ماڈلنگ) کے ذریعے وہ اپنی شخصیت، تخلیقی قوت، احساسات، جذبات اور مشاہدات کو مؤثر انداز میں پیش کر سکتے ہیں۔ آرٹ کی یہ مختلف اصناف، جہاں بچوں کی مخفی صلاحیتوں کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ وہاں ان کی خامیوں کو بھی آشکارا کرتی ہیں۔ ان خامیوں کا بروقت تدارک کر کے، ان کی شخصیت اور جبلی صلاحیتوں کو اجاگر کیا جا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے آرٹ اب ترقی یافتہ ممالک میں بچوں کی تعلیم کا لازمی جزو بن گیا ہے۔

itsurdu.blogspot.com

ناقص طریقہ

ہمارے یہاں عام سکولوں میں بچوں کو آرٹ کی تعلیم دینے کا جو طریقہ مروج ہے وہ نہ صرف ناقص اور غیر مؤثر ہے بلکہ بچوں کے فطری تقاضوں کے بھی منافی ہے اس سے بچوں کی صلاحیتیں ابھرنے اور نکھرنے کی بجائے دب کر رہ جاتی ہیں۔ دوسرے مضامین کی طرح بچوں کو آرٹ کے متعلق بعض اصول یا گر از بر کرانے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ وہ اشیاء کا ظاہری تناسب سمجھنے لگیں اور انہیں ان کا روشن اور تاریک رخ پیش کرنے کا ڈھب آجائے پھر ان اشیاء (کرسی، دوات، پتہ، تتلی) کی شکلیں بنانے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ جب بچوں کے ہاتھ میں روانی آجاتی ہے اور وہ صاف ستھری شکلیں بنانے لگ جاتے ہیں۔ تو اساتذہ کو یک گونہ اطمینان ہو جاتا ہے۔ کہ بچوں نے آرٹ سیکھ لیا ہے اسے وہ اپنے نزدیک "آرٹ ایجوکیشن" سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقتاً مشق کر کے، چیزوں کی ہو بہو شکلیں بنا لینا، ایک میکانکی فعل ہے جو احساسات اور تخیل سے بالکل مبرا ہوتا ہے۔ اس قسم کی آرٹ ایجوکیشن کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب بچے تعلیم ختم کر کے سکول سے باہر آتے ہیں تو وہ آرٹ کی قدر شناسی سے محروم ہوتے ہیں اور ان میں آرٹ پر تنقید کرنے کی صلاحیت بھی مفقود ہوتی ہے۔

آرٹ ٹیچر کا فرض

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ چھوٹے بچوں میں ذرا سا شعور بیدار ہو تو وہ کاغذ پنسل لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور لکیریں کھینچنا ان کا دلپذیر مشغلہ ہوتا ہے۔ یہ لکیریں بچوں کو بہت عزیز ہوتی ہیں۔ مگر بڑوں کے نزدیک ان میں کوئی کشش یا جاذبیت نہیں ہوتی پھر جوں جوں بچے کے تجربات اور مشاہدات میں اضافہ ہوتا ہے اس کے احساسات میں تسلسل اور تخیل میں رنگینی اور وسعت آتی جاتی ہے۔ اچھے آرٹ ٹیچر کا یہ اولین فرض ہے کہ بچوں کے شوق کو ابھارے، انکی مخفی صلاحیتوں کی آبیاری کرے اور احساسات اور جذبات کے اظہار کے لئے آسانیاں پیدا کرے۔ یہ درست ہے کہ استاد بچوں کو رنگوں کے متعلق ذہنی امتیاز

اور ذوق عطا نہیں کر سکتا۔ یہ صفت فطری ہوا کرتی ہے لیکن ایک اچھا استاد شکل و صورت کی موزونیت اور خطوط میں توازن کا احساس ضرور پیدا کر سکتا ہے۔

مصور کا قرینہ

ایک باشعور مصور، بڑی کاوش سے تصویر کی نوک پلک سنوارتا ہے پھر اس کے لئے رنگوں کا انتخاب اور ان کی ترتیب بڑے سلیقے اور قرینے سے کرتا ہے۔ اسی کے برعکس بچے نسبتاً جلدی تصویریں بنا لیتے ہیں۔ ان کے رنگوں کا امتیاز اور حسن تناسب ایک جبلی فعل ہوتا ہے۔ بچوں کی تخلیقی قوت فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے سازگار اور آزاد ماحول کا ہونا ضروری ہے۔ استاد کا فرض ہے کہ وہ بچوں کو اصولوں اور قاعدوں کا پابند نہ بنائے۔ یا ان پر آرٹ کے متعلق مختلف نظریات کا بار ڈالنے کی بجائے، ان کے لئے آزاد ماحول مہیا کرے۔ ان کے شوق کو ابھارے۔ جبلی صلاحیتوں کی حوصلہ افزائی کرے۔ انھیں اپنی تخلیق سے محبت کرنا سکھائے۔ ان میں خود اعتمادی پیدا کرے اور جب وہ اپنے جذبات احساسات اور مشاہدات کا ڈرائنگ یا پینٹنگ کے ذریعے بے جھجک اظہار کرنے لگ جائیں تو پھر ان میں فنی قابلیت پیدا کرے تاکہ ان کی تصویریں نہ صرف آرٹ بلکہ فنی نقطہ نظر سے بھی کامیاب ہوں ؎

---

itsurdu.blogspot.com

کیا پاکستانی بچے کا کوئی کلچر نہیں ہوتا

گلزار آفاقی

جب بڑے یہ کہیں کہ بچے کا کوئی کلچر نہیں ہوتا تو یوں لگتا ہے سیڑھی کی چوٹی پر کھڑا ہوا شخص پہلے پائیدان کی نفی کر رہا ہے۔ فطرت نے بنیادی طور پر آدم کو تخلیق کیا ہے یہ الگ بات ہے کہ ہم عصری فہم اور تقاضے کے تحت اسے عمر کی نسبت سے بچہ، نوعمر نوجوانوں یا بوڑھا کہہ دیتے ہیں، بالکل جس طرح عصر یا زمانہ دراصل لاانتہا لمحوں کا ایک تسلسل ہے۔ مگر ہم نے معاشرتی ضروریات کے تحت عصر یا زمانے کو ماضی حال یا مستقبل میں تقسیم کر رکھا ہے۔ سو جس طرح عمر کی یا افقی سفر یا ارتقاء دراصل ایک تسلسل ہے۔ اسی طرح ایک فرد کی عہد سے لحد تک کی زندگی بھی ایک مسلسل سفر ہے جس کے مختلف ارتقائی مراحل پر ضروریات اور تقاضے تو مختلف ہو سکتے ہیں مگر یہ کہنا کہ سفر کے فلاں حصے میں اس کا کوئی تقاضہ یا کوئی کلچر نہیں ہوتا۔ حقائق سے گریز اور چشم پوشی کے مترادف ہے۔

مگر پہلا سوال یہ کہ ثقافت یا کلچر سے کیا مراد ہے؟

ہمارے ہاں تہذیب، ثقافت یا کلچر کے الفاظ کچھ اس طرح سے گڈمڈ سے ہو گئے ہیں کہ ان کا کوئی ایسا واضح مفہوم سامنے نہیں آتا جیسا گلاس، میز یا روٹی کے اسماء سے مترشح ہوتا ہے۔ فارسی اور عربی زبان میں کلچر کے لئے تہذیب کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں عربی میں تہذیب کے معنی ہیں، درخت تراشنا، کاٹنا، چھانٹنا یا اس کی درستی کرنا تاکہ اس کی زندگی میں اضافہ ہو، فارسی میں تہذیب کے معنی ہیں، آراستن و پیراستن، پاک و درست اور اصلاح نمودن۔ تہذیب کا لفظ قول و فعل میں شائستگی، خوش اخلاقی اور حسن توازن کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں اردو میں ثقافت کا لفظ کلچر کا ترجمہ ہے۔ کلچر لاطینی زبان کا لفظ ہے اس کے معنی ہیں زراعت، شہد کی مکھیوں، ریشم کے کیڑوں، سیپیوں اور بیکٹیریا کی افزائش و پرداخت، جسمانی و ذہنی اصلاح اور ترقی، کھیتی باڑی۔

ان لغوی معانی کی سماجی تطبیق سے جو مفہوم سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ ثقافت یا کلچر ایک قوم کے فکری مادی اور خارجی اسلوب فکر و عمل کے اظہار کا نام ہے۔ زبان، جذبے رسمیں، ریت رواج معاش کے ذریعے، سماجی رشتے، رہن سہن، پہناوے، فنون لطیفہ اور علم و ادب ثقافت کے مختلف مظاہر ہوتے ہیں۔ فنون لطیفہ اور علم و ادب کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ ثقافتی رویے کی تبلیغ، ترسیل، توصیف، تنقید اور تزئین کرتے ہیں تاکہ انسان ذات کی مضمر صلاحیتیں خوش اسلوبی سے نشوونما پاتے ہوئے تکمیل کے مراحل طے کرتی رہیں۔

ثقافت کی تشکیل میں تین بنیادی عوامل کارفرما ہوتے ہیں:

۱۔ جغرافیہ ۲۔ عہد گزشتہ (تاریخ) ۳۔ نظریہ

گویا پاکستان کے حوالے سے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ پاکستانی ثقافت ہمارے جغرافیے ہماری تاریخ کے، ہمارے دین کے سہ جہتی اشتراک سے وجود پانے والا انسانی رویہ ہے۔

ایک جغرافیائی خطے کے موسمی حالات، پہاڑ، ریگستان، سبزہ زار، میدان، دریا اور سمندر، یہاں بسنے والوں کے مزاج، لباس اور احساس کو مخصوص بشری سانچوں میں ڈھال دیتے ہیں۔ محبت و نفرت، شجاعت، مردانگی، خیر و برکت و رقابت و کے جذبے پیدا ہوتے ہیں جن کے اظہار کے لئے لسانی تشکیلات ہوتی ہیں اور لوک ادب لوک گیت اور شعر و نغمہ وجود پاتے ہیں۔

کسی جغرافیائی خطے کا سماجی عمل وقت کے وسیع تر پھیلاؤ میں تاریخ کو جنم دیتا ہے قبیلوں اور آبادیوں کی نقل مکانیاں ہوتی ہیں۔ نسلی اور گروہی سابقتیں پروان چڑھتی ہیں۔ ارتباط و انتشار اور بقا و فنا کی جنگ و تازیں تہذیبوں اور ثقافتوں کے رد و قبول کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اس اعتبار سے ایک جغرافیائی اکائی میں وقت کے عظیم تر تناظر میں جو تہذیبیں اور ثقافتیں نمو پاتی، پھیلتی اور پھولتی ہیں۔ وہ اس جغرافیے میں بسنے والوں کا تاریخی سرمایہ ہوتی ہیں۔ پاکستان کے حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ گندھارا، ٹیکسلا، ہڑپہ، موہنجوداڑو، میرپور اور مستقبل میں دریافت ہونے والے شام آثار قدیمہ اہل تاریخی حقیقتیں ہیں جن سے اہل پاکستان کا تاریخی اور حیاتیاتی تسلسل پایا جاتا ہے اس سے انکار ناممکن ہے۔

itsurdu.blogspot.com

جغرافیے اور تاریخ کی حقیقت کے ساتھ ساتھ ایک بڑی بھرپور حقیقت نظریے یا دین کی شکل میں پائی جاتی ہے۔ پاکستان کے لوگ قدیم ادوار میں اوہام پرست تھے۔ پھر مختلف چھوٹے بڑے مذاہب کی تردید و قبولیت کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ اسلام کے آفاقی اور انقلابی دین نے پاکستان کے دشیکوں کو روحانی و مادی اعتبار سے ایک ترقی پسند اور روشن فوید سنائی۔ ایک نئے سماجی نظام فکر نے اہل پاکستان کو ایک منفرد قوم کی حیثیت عطا کی اور یوں پاکستانی قوم کے پہلے سے وجود جغرافیائی اور تاریخی تسلسل پر دین اسلام کی چھاپ گہری ہوتی گئی، یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء میں اہل پاکستان ایک الگ وطن کے مطالبے کی کامیابی کی صورت میں برعظیم جنوبی ایشیا میں اپنے وجود کے اظہار نو کا اعلان کرتے ہیں۔

اس اعتبار سے پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے اس کے خمیر میں یہ عہد شامل ہے کہ اس سرزمین پر اللہ کی حاکمیت اور اسلام کی حکمرانی ہوگی۔ اسلام کے عطا کردہ عدل حکمرانی معاشی انصاف اور حریت فکر کا راج ہوگا۔ یہ بھی اسلام ہی کی آفاقیت اور ابدیت کا اعجاز ہے کہ بنیادی اور رہنما اصولوں کے ساتھ ساتھ یہ ایک خطے اور زمین کے جغرافیائی اور تاریخی حقائق کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرتا۔ بلکہ ان حقائق کی روشنی میں پروان چڑھنے والے مثبت تعمیری اور زندگی بخش ثقافتی رویوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ قابل اصلاح پہلوؤں کو دین کے مطابق بناتا ہے اور فقط اپنے اعمال اور رویوں کو مسترد کرتا ہے جو منفی غیر تعمیری اور غیر صحت مند مقاصد کے علمبردار ہوں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہر عہد اور پوری کائنات کے لئے رہنما ہونے کے باوجود قرآن حکیم جغرافیائی حقیقت کے پیش نظر عربی زبان میں نازل ہوا۔ اس دور کے عرب معاشرے کی ایسی قدیم روایات جو۔ اسلام کے بنیادی اصولوں سے متصادم نہ تھیں۔ انہیں پنپنے دیا گیا۔ مثلاً زبان، لباس، فصاحت و بلاغت، غنائت عسکری، ہنر مندیوں اور دنوں کی ترتیب۔ حتیٰ کہ قمری کیلنڈر کا رواج بھی اپنائے رکھا گیا۔ اس حقیقت کو آج ہم پوری دنیا میں جاری و ساری دیکھتے ہیں اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی ۴۲ کے لگ بھگ ریاستیں ہیں جنھیں جغرافیائی اور تاریخی حالات کے فرق ایک دوسرے سے الگ ثقافتی تشخص اور پہچان دے رکھی ہے۔ شاید آج کے زمانے کی یہی جدید ریاستیں ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے مختلف

قبائل یا گروہوں سے تشبیہ دی ہے تاکہ یہ پہچانے جاسکیں۔

اب ہم پاکستانی بچے کی طرف آتے ہیں:

اس وقت تک کہ بحث سے ثقافت کا جو پیکر ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ جغرافیائی تاریخی اور دینی حقائق اور تعلیمات کی روشنی میں وہ رویہ جو ایک پاکستانی کے احساس فکر اور عمل کا حصہ ہے، وہی پاکستانی ثقافت ہے۔ ہر پاکستانی اپنی ثقافتی اقدار کو اگلی نسل تک منتقل کرنے کا خواہش مند ہے جس کے لئے ارتقا کے فطری اصول موجود ہے اگر ہم ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی صاحب کا نکتہ نظر تسلیم کرلیں کہ بچے کا کوئی کلچر نہیں ہوتا تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اپنے ثقافتی اور کلچرل رویے کو اگلی نسل کو کب منتقل کریں گے؟ کیا یہ ممکن ہے، کہ جب بچہ بچپن کی حدود سے نکل جائے یعنی عمر کے چودھویں یا پندرھویں برس میں پہنچے تو اسے کلچر کا انجکشن لگا دیا جائے۔

جہاں تک ہم سمجھ پاتے ہیں بچے کی حیثیت تو ایک بیج سی ہوتی ہے جسے درخت بننے تک ایک سائنٹیفک عمل سے گزرنا پڑتا ہے اس دوران اسے توازن اور تناسب کے ساتھ مٹی، ہوا، روشنی، پانی، حرارت اور وقت کی کمی بھی ضرورت ہوتی ہے اور باغبان کی محنت اور ضرورت اور قوت برداشت بھی درکار ہوتی ہے اپنی عناصر اور عوامل کے توازن بدوش آہنگ سے ارتقا کے فطری اصولوں کے مطابق بیج درجہ بدرجہ کونپل سے شگوفے اور شگوفے سے پودے اور پودے سے درخت میں تبدیل ہوتا ہے گویا مطلوبہ مقصد کے حصول کے لئے ایک مکمل متوازن، متناسب، مربوط اور مسلسل عمل کی ضرورت ہوتی ہے کسی ایک مرحلے کی جزوی یا کلی ضروریات یا تقاضے سے انکار یا فرار سے مقصد برآری ممکن نہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تحفظ خویش اور تولید نسل کی حیوانی جبلت کے سوا انسان کی کوئی فطرت نہیں۔ وہ کوئی طے شدہ ثقافتی مزاج لے کر دنیا میں نہیں آتا۔ البتہ قدرت نے اسے مختلف النوع صلاحیتیں بخش رکھی ہیں۔ جن کی نشوونما وہ اپنے ثقافتی ماحول میں ہی کرسکتا ہے اور یہ ثقافتی ماحول ایک بچے کے لئے کس قدر ناگزیر ہے اس کا اندازہ

itsurdu.blogspot.com

اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ جانداروں میں انسانی بچہ ہی وہ واحد مخلوق ہے جو اپنی ابتدائی زندگی یا یوں کہہ لیجئے کہ بچپن کے طویل ماہ و سال، دوسروں یعنی والدین، اساتذہ اور ماحول کی دست نگری میں گزارتا ہے۔ باقی مخلوقات پیدائش کے بعد مقابلتاً بہت جلد اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ انسانی بچے کے ساتھ قدرت کا یہ امتیازی سلوک اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ منشائے خداوندی ہی یہ ہے کہ انسان اپنے بچپن کا زریں عہد مکمل طور پر اپنے ثقافتی ماحول میں گزارے۔ یہ اسی ثقافتی ماحول کا اثر ہوتا ہے کہ ایک معاشرے میں پیدا ہونے والا بچہ سور کا گوشت ضمیر کے پورے اطمینان کے ساتھ کھا لیتا ہے۔ والدین سے ذرا سی جھڑپ پر پولیس سے رجوع کرتا ہے۔ جسمانی برہنگی کو معیوب نہیں سمجھتا۔ وغیرہ وغیرہ

مگر دوسرے معاشرے میں ایسا ممکن نہیں۔ ایک ہی جنس یا ایک سے حالات و واقعات کے بارے میں مختلف رویہ دو مختلف ثقافتوں ہی کا آئینہ دار ہے جسے بچے اپنے مخصوص ثقافتی ماحول میں اپناتے ہیں۔

اب آیئے دیکھتے ہیں کہ ایک پاکستانی بچے کی ذات ہمارے ثقافتی ماحول سے کن کن مدارج میں اثر پذیر ہوتی ہے۔

اس دنیا میں آنکھ کھولتے ہی بچے کو موسم اور رواج کے مطابق لباس پہنایا جاتا ہے پھر اس کے کانوں میں اللہ کی تکبیر اور حضرت محمد صلعم کی رسالت کی شہادت پر مبنی سرحدی پیغام گونجتا ہے۔ اسلامی روایات کے مطابق اس کا نام تجویز کیا جا رہا ہے۔ ان کے کانوں میں ماں لوری کا ترنم رس گھولتا ہے۔ مقامی رواجوں کے مطابق خوشی و مسرت کے مختلف مظاہر دیکھنے میں آتے ہیں۔ غرضیکہ زچگی سے لے کر بچے کی عمر کے خاص حصے تک اذان گھڑتی (کسی نیک اور پارسا بزرگ کے ہاتھوں بچے کو شہد چٹانا) عقیقے، عقیقے، سالگرہ بسم اللہ اور اسی طرح کی متعدد رسمیں اور رواج ہیں جو خالصتاً ایک بچے کے ثقافتی عمل سے مختص ہیں۔

یہی نہیں شفقت اور ممتا کے جذبوں کو کیا کہیئے گا جو خالصتاً بچوں کے رہین منت

ہیں اور جن کے باعث انسانی سرگرمیوں میں نرمی، مٹھاس، ملاحت، خدمت اور خود سپردگی جیسے اعلیٰ اوصاف پروان چڑھتے ہیں۔ ہمارے لوک ادب اور شعریت اور بولیوں میں بچوں کا کلچر رنگا رنگ انداز میں بکھرا پڑا ہے۔

جوں جوں بچہ ہوش سنبھالتا ہے اس کی وسعت آشنا میں ایک کائنات آباد ہونے لگتی ہے جس میں ظاہر کی اشیا کے ساتھ تخیلاتی مظاہر بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ تجسس اور جستجو کے اوصاف کے تحت وہ گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہے۔ گھر والوں، والدین اور بہن بھائیوں کی حرکات و سکنات اس کے ذہن پر نقش گری کرتی ہیں۔ اس لئے پسند ناپسند کا ادراک ہونے لگتا ہے۔ بڑوں کی پیروی جستجو اور پالینے کی صلاحیت کی افزائش کے ساتھ ساتھ وہ سنے گئے الفاظ کو توتلی زبان میں دہرانا شروع کر دیتا ہے (بچے کی زبان شناسی میں ثقافتی ماحول کس قدر اثر انداز ہوتا ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک ہی معاشرے میں آمدنی کے دو مختلف مدارج رکھنے والے کنبوں کے بچوں کے لسانی ذخیرے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ امیر گھرانے کا بچہ اُپلے، دھوئیں، پھونکنی، باسی روٹی، چمٹے وغیرہ وغیرہ سے ناآشنا ہوگا۔ جبکہ غریب کنبے میں پروان چڑھنے والا بچہ فریج، ایرکنڈیشنر، ڈی فریزر، لولی پاپ، وی سی آر اور کاروں کے ماڈلوں سے قطعی طور پر بے بہرہ ہوگا) بچہ مشاہدے کی صلاحیت سے اٹھنے بیٹھنے اور سونے جاگنے کے آداب سیکھتا ہے اس پر اچھائی برائی صفائی اور گندگی کا فرق آشکارا ہوتا ہے۔ بڑوں کی عزت چھوٹوں سے محبت کے گر سیکھتا ہے۔ بہن بھائیوں اور سنگی ساتھیوں کی رفاقت اسے محبت اور مسابقت کے جذبے اور عمل سے سرشار کرتی ہے۔ تفریح، کھیل کود اور تجسس کا میلان اسے کارٹونوں، بٹنوں سپیروں کھلونوں، گڑیوں، پھولوں رنگین مچھلیوں، پرندوں اور کہانیوں کی طرف مائل کرتا ہے۔ یہ رنگا رنگی مادی گرد و پیش کے ساتھ بچے کے ذہن کو تخیلاتی وسعتوں کی طرف ڈھکا دیتی ہے جہاں اس کی سوچ، ادراک اور تصور کی صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں (اگر یہ کہا جائے کہ ٹیلی ویژن کے اکثر مثبت اور تعمیراتی پروگراموں نے پاکستانی بچے کی ذہنی نشوونما میں شاندار کردار ادا کیا ہے تو بے جا نہ ہوگا)

itsurdu.blogspot.com

یہی وہ دور ہے جب بچہ پریوں اور شہزادوں کی مہماتی داستانوں اور نظموں میں دلچسپی لیتا ہے۔ دراصل بچہ ہم پسندی کے باعث خود کو کسی ایک تخیلاتی کردار میں ڈھال لیتا ہے اور پھر داستان یا نظم کی وسعتوں کا حصہ بن جاتا ہے۔

سکول کی چار دیواری میں داخل ہونے تک بچہ اپنے گھریلو ثقافتی ماحول سے بہت حد تک مانوس ہو چکا ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بڑوں کی طرح وہ اس کے اظہار و بیان کی قدرت سے محروم ہوتا ہے۔ البتہ اس میں لچک پذیری اور قبولیت کا عنصر بے پناہ ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ سکول پہنچنے تک بچہ بیج سے پودا بن چکا ہوتا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس پودے کے مستقبل میں تناور درخت بننے کا انحصار اساتذہ کے خلوص محنت مہارت، تعلیمی مواد (نصابی و غیر نصابی سرگرمیاں) اور عمومی تربیت پر ہوتا ہے اس سے انکار نہیں کہ سکول اور گھر میں بچہ جس قدر وقت گزارتا ہے اس کا باہمی تناسب تقریباً ایک اور تین کا ہے اس لئے اگر گھر کا ماحول ثقافت کی مثبت قدروں سے مطابقت نہیں رکھتا تو اسکول کی بہتر تعلیم و تربیت کے مثبت اور افادی پہلو مکمل طور پر بچے کی ذات کا جزو نہیں بن پاتے۔ مگر اس کے باوصف درسگاہ میں گذرا ہوا وقت بچے کے لئے "روئیدگی کے موسم" کی حیثیت رکھتا ہے جس میں پودے کی مضمر صلاحیتوں کو نشوونما کا بھرپور موقع میسر آتا ہے۔

درسگاہ کا ماحول بچے کے گھریلو ثقافتی وژن کو کسی نہ کسی سطح تک معاشرتی وژن میں پھیلا دیتا ہے وہ ہم عصروں کے ساتھ زندہ رہنے کے آداب سیکھتا ہے۔ گھر کے محدود فضا میں پروان چڑھنے والے مسابقت و مفاہمت، رفاقت و رقابت کے جذبے مزید فروغ پاتے ہیں۔ تعلیمی و تربیتی سرگرمیوں (نصابی و غیر نصابی) کے ذریعے سے اسے اپنے ماحول اپنے عقیدے اپنے جغرافیے اور اپنی تاریخ کی آگہی ہونے لگتی ہے اسے رسم و رواج کے اندازے ہوتے ہیں۔ بچوں میں گڈے گڈی کی شادی اور اس موقع پر ادا کی جانے والی رسمیں اس کو عمر انسانیت کی اپنی ثقافتی میراث ہے۔ باخبری کی زندہ گواہی ہے یہی نہیں سرشام دیا بتی منور کرنے کا شعور بچوں کا بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ چھوٹی بچیوں کو یہ بھی علم

ہوتا ہے کہ اذان کی آواز سنتے ہی سر کو دوپٹے سے ڈھانپ لیا جاتا ہے اور یہ کہ روٹی کا ٹکڑا زمین پر گرا ہوا ملے تو اسے اٹھا کر کسی اونچی جگہ رکھ دیتے ہیں جہاں وہ راہ گیروں کی ٹھوکروں سے محفوظ رہے۔ نمک کو زمین پر نہیں گرانا چاہیئے ورنہ روز محشر ملکوں سے اٹھانا پڑے گا۔ رسول پاک کا نام سنتے ہی ہاتھوں کی پوریں چوم کر آنکھوں سے لگائی جاتی ہیں یہاں خدا کی رحمت ہوتے ہیں اس لئے ان کی خدمت کرنی چاہیئے۔ نفی پر کیا ہوتا ہے کہ خوشی پر کیا؟

بچہ اپنے گرد و پیش کے ثقافتی عمل کو بڑی تیزی سے اپنی ذات میں اتارتا جاتا ہے جب وہ اجتماعی کورس کی شکل میں لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" یا پاک سرزمین شاد باد کا قومی ترانہ گاتا ہے تو وہ دراصل ایک ایسے پاکستانی بشر کے منشور کا اعلان کر رہا ہے۔ جو دنیا بھر میں امن سلامتی اور خیر و برکت کے اجالے پھیلانے کا داعی ہے۔ پاک فضاؤں میں لہراتا ہوا سبز و سپید ہلالی پرچم اس کے لئے محض ایک کپڑے کا ٹکڑا نہیں۔ جسم و جان میں سرایت کر جانے والا انتہا اور سربلندی کا جذبہ ہے۔

مینار پاکستان، زیارت کی ریذیڈنسی، مزار قائد اعظم اور قلعہ لاہور موہنجو داڑو کے آثار شہباز قلندر یا داتا گنج بخش کا مزار، چوک یادگار کا نشان، مسجد شہدا اور بادشاہی مسجد جیسی عمارتیں اس کے لئے محض اینٹ اور مصالحے کا مجموعہ نہیں رہتیں۔ آہستہ آہستہ شعوری فروغ کے ساتھ ساتھ اس کے لئے اپنی ثقافتی شناخت کا ایک زبردست اور زندہ استعارہ جذبہ اور حوالہ بن جاتی ہیں۔

غرضیکہ یوں کہیئے کہ ایک پاکستانی بچہ اسکول چھوڑنے یا بچپن کی حدود پھلانگنے تک مکمل طور پر ایک ایسا پاکستانی شہری بن چکا ہوتا ہے جو اپنی عمر کے تقاضوں کے مطابق احساس فکر اور عمل کے دائروں میں پائے جانے والے اپنے ثقافتی رویوں سے آشنا ہو چکا ہوتا ہے۔ ماہرین نفس انسانی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ایک بچہ اپنے کردار اور عمل کے حوالے سے مستقبل کا پتہ دے دیتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بچپن کی خوشگوار یادیں تمام عمر انسان کے لئے NOSTALGIC دباؤ سے آسودہ ہونے کا موثر ذریعہ بنی رہتی ہیں میں تو یہاں تک

itsurdu.blogspot.com

کہنے کو تیار ہوں کہ عمر کے اس سنہری دور میں یہ پاکستانی بچہ ہی ہے جو ہمارے شاندار ثقافتی ورثے کا بہترین نمائندہ ہوتا ہے۔ تضادات سے معمور ہمارے معاشرے میں یہ بچہ ہی ہے جو جھوٹ کے مقابلے میں سچائی، بناوٹ کے مقابلے میں سادگی، منافقت کے مقابلے میں کھرے پن، ریاکاری کے مقابلے میں دیانتداری، تساہل کی بجائے تحرک، فرار کی بجائے اقرار، قنوطیت کی بجائے رجائیت، پژمردگی کی بجائے شگفتگی، منفی قناعت کی بجائے مثبت تجسس اور جستجو اور تضاد کی بجائے اجلے پن اور یک جہتی کے بھرپور ثقافتی رویے کا علمبردار بنکر سامنے آتا ہے۔

اب کہیئے کہ پاکستانی بچے کا کوئی کلچر ہے یا نہیں اور یہ کہ اس کی ذات اور شخصیت کی تربیت اور نشوونما کے لئے ایسی نصابی و غیر نصابی کتابوں کی ضرورت ہے یا نہیں، جن میں موجود مواد ہمارے ماحول اور ثقافت سے ہم آہنگ ہو اور جس کی شدید ضرورت کا احساس کرتے ہوئے زیر حوالہ منیجر مرتب کیا گیا۔

جیسا کہ میں نے مضمون کے آغاز میں کہا تھا کہ جب بڑے یہ کہیں کہ بچے کا کوئی کلچر نہیں ہوتا تو یوں لگتا ہے، سیڑھی کی چوٹی پر کھڑا ہوا شخص پہلے پائیدان کی نفی کرتا ہے۔ یا نخل سایہ دار تلے بیٹھا ہوا مسافر اس شک میں مبتلا ہو جائے کہ اس تناور درخت کا کوئی بیج بھی تھا؛ دراصل ہم بڑوں کا یہ طرز عمل اس تضاد کی عکاسی کرتا ہے جو ایک منفی عنصر کے طور پر ہمارے ثقافتی ماحول کو گھن کی طرح چاٹ رہا ہے جب بچہ بچپن کی حدود پھلانگتا ہے تو تمام تر معصومیت کے باوجود وہ بھی تضادات کے اسی جہنم میں جھلسنے لگتا ہے؛ کیا ہم اپنے مستقبل کو اس جہنم کی بجائے پاکستانی ثقافت کی فردوس گم گشتہ کا حصہ نہیں بنا سکتے؟

پاکستان میں بچوں کا ادب اور مسائل

ریاض صدیقی

بیسویں صدی میں ہندوستان کی تقسیم کا عمل ایک ایسے مرحلے پر پایۂ تکمیل کو پہنچا جب ہند اسلامی تمدن اپنی عمر کے ایک ہزار سال مکمل کر کے تاریخ کی اٹل حقیقت بن چکا تھا۔ تشکیل پاکستان تو محض اس ہند اسلامی تمدن کی ایک کروٹ تھی اس تہذیب کا پورا مزاج اور روایات کا تسلسل نظریہ پاکستان کے جسم میں اعصابی جال کی طرح در آیا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد رونما ہونے والے تمام نئے تقاضے اور مسائل اسی تناظر میں ابھرے۔ اسی پس منظر میں بچوں کی تعلیم و تربیت اور مستقبل کے لئے ان کی شخصیت کی تعمیر کا سوال بھی پیدا ہوا۔ مستقبل تو بہر صورت ایک ایسی نسل کا منتظر تھا جس کی تربیت آزاد فضا میں یوں کی گئی ہو کہ ایک طرف دینی شعور۔ تہذیبی روایات اور قومی تشخص کا بھرپور اظہار ہو تو دوسری طرف صنعتی سائنسی تعمیر و تشکیل اور جدید جمہوری اقدار کے استحکام کے لئے ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں اپنا کردار ادا کریں۔ قدیم و جدید کے مابین بامعنی اور خوشگوار توازن۔ جدید اقدار کے منتخب اجزا سے مفاہمت اور تعلیم یافتہ طبقہ کو انگریزی زبان کے رعب و جلال سے رہائی دلانے کے لئے جس جدوجہد کی ضرورت آج محسوس ہو رہی ہے۔ اس کا صحیح وقت قیام پاکستان کے بعد والا ہی عرصہ تھا۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم کے ساتھ ساتھ ہی بعض نظریاتی اور سیاسی و سماجی حقیقتیں منظر عام پر آئیں لیکن معاشرتی، علمی و فکری اور تمدنی سطح پر نئے معاشرے نے اس مجموعی ورثے ہی کو حاصل کیا جو صدیوں کے سفر کا نتیجہ تھا۔ بچوں کے ادب، ادیب اشاعتی اداروں اور ادبی رسائل کا ایک معتبر حلقہ جو متحدہ ہندوستان میں نصف صدی تک اس فکر کی آبیاری کر چکا تھا۔ نئے ملک کے حصے میں آیا۔

کہ ہمیں بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک فعال روایت ورثے میں ہاتھ آئی تھی

itsurdu.blogspot.com

اولین دہائی میں اس روایت سے کوئی کام نہیں لیا گیا۔ اس دور کی کارکردگی پر نظر ڈالئے تو پتہ چلتا ہے کہ ہماری سیاسی و فکری قیادت اور سرکاری تنظیم جو باہر سے ہجرت کر کے یہاں آئی تھی۔ اور اپنی اہلیت اور ذہانت میں یکتا تصور کی جاتی تھی۔

تو [illegible]ینی اور تہذیبی تشخص کے زبانی دعوے ضرور کرتی رہی لیکن نو وارد ان کی تعلیم و تربیت کے لئے کوئی پائیدار قومی نظام نہ دے سکی۔ سرکاری سطح پر بوشش سول سروس اور فکری اور علمی سطح پر لارڈ میکالے کا تعلیمی طریقہ کار ہی سکہ رائج الوقت قرار دیئے گئے۔ یہی وہ قوتیں تھیں جنھوں نے ابتدائی تشکیل دور میں جمہوری اقدار، جدیدیت اور بین الاقوامی روابط کے نام پر ہمارے معاشرے میں مغربی تہذیب اور انگریزی زبان کو رائج کر دیا اس دور نے ہمیں امراء سرکاری افسروں، جاگیر دار سیاست دانوں اور نو دولتیوں کا وہ مضبوط طبقہ مہیا کیا ہے جو مغربی تمدن اور انگریزی زبان کو تحفظ دینے میں ڈھال کا کردار ادا کر رہا ہے۔

پاکستان میں بچوں کے ادب کی صورت حال اور اس روایت کے ارتقا پر کوئی گفت گو اس وقت تک کیونکر نتیجہ خیز ہو سکتی ہے جب تک کہ روایت کو تاریخی ماضی کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش نہ کی جائے۔

برصغیر کی تہذیبی اور معاشرتی تاریخ کے ابتدائی ادوار میں بچوں کی تعلیم و تربیت کا نہ تو کوئی نظریاتی فلسفہ ہی وجود رکھتا تھا، اور نہ کوئی جداگانہ یا منظم طریقہ کار رائج تھا برصغیر کی سرزمین پر تشکیل پانے والی ہند اسلامی تہذیب پر یہ رجحان ایک بدنما داغ یوں ثابت ہوا کہ ظہور اسلام کے بعد خلافت راشدہ اور پھر اس کے بعد سائنسی اور فکری تحریکات کے ادوار میں بڑوں اور بچوں کی تعلیم و تربیت قومی زندگی کا نہایت اہم اور ضروری جز تھا برصغیر کے مسلمان معاشرے میں بچوں کی تعلیم کا آغاز گھر کی چار دیواری سے ہوتا تھا اور پھر مساجد میں قائم مدرسوں پر ختم ہو جاتا تھا۔ یہ تعلیم محض دینی عقائد تک محدود ہوتی تھی اس قسم کی محدود تعلیم کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے سب سے پہلے امیر خسرو نے "خالق باری" لکھی۔ بعد میں "خالق باری" کا ایک سلسلہ چل نکلا جو آخر تک جاری رہا۔ انیسویں صدی کے

درمیانی عرصے تک تعلیم و تربیت کی یہی روایت نظر آتی ہے۔ ان صدیوں میں تعلیم کا تصور امراء اعلیٰ طبقوں اور ان طبقوں کی پیروی کرنے والے متوسط طبقے تک محدود تھا۔ عوام کی غالب اکثریت پسماندہ اور جاہل ہونے کی بنا پر تعلیم سے یکسر ناآشنا تھی۔ حکمران طبقہ اور اس کے ہمنوا متوسط طبقے کے شرفا اپنے گرد و پیش کی اکثریت کو رذیل اور کمینہ کہا کرتے تھے ہمارے یہاں ابھی تک یہی معاشرتی روایت زندہ ہے۔

قدیم دور کے محدود تصورِ تعلیم کا تانا بانا خوف اور جبر سے تعمیر تھا۔ والدین اور اساتذہ معصوم بچوں پر سختی بھی کرتے تھے اور ان کے ذہنوں میں خوف اور وہم کا وہ زہر تحلیل کر دیتے تھے جو بعد میں ان کی شخصیت کا لازمی جز بن جاتا تھا۔ اور معاشرتی ارتقا کے سارے راستے بند ہو کر رہ جاتے تھے۔

۱۸۵۷ء کے بعد سائنسی ایجادات اور نئی مصنوعات کو قبول کرنے سے قبل مسلمانوں میں خوف اور شک کا جو رجحان پیدا ہوا تھا اس کا سبب متذکرہ تربیت ہی تھی۔ تعلیم و تربیت کا نہایت محدود سا تصور جس کا آغاز چودھویں صدی عیسوی سے ہوا تھا۔ غالب کے "قادر نامہ" پر تمام ہوا۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہزار سالہ تہذیبی، فکری، علمی اور معاشرتی اقدار کا پورا محل ریت کی دیوار ثابت ہوا۔ انگریزوں کے زیر اثر فروغ پانے والی نئی روشنی سے استفادہ کرنے والوں نے پہلی بار بچوں کی تعلیم و تربیت اور مستقبل میں ان کے کرداروں کی اہمیت کو محسوس کر لیا۔ اس مرحلے پر جو نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔ وہ ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی ہیں۔ خوش قسمتی سے ان لوگوں نے دہلی کالج جیسے ادارے میں تعلیم حاصل کی تھی۔ جو برصغیر کے روایتی اداروں سے یکسر مختلف تھا۔ حالی اگرچہ اس کالج سے وابستہ ہونے کی خواہش رکھتے تھے مگر کامیاب نہ ہوتے لیکن نئے اثرات کے پھیلاؤ سے انہوں نے بھی استفادہ کیا۔

جدید مغرب میں بھی بچوں کے ادب کی انفرادی حیثیت کا احساس انیسویں صدی میں عام ہوا۔ چنانچہ مغرب میں جن دنوں "عجیب دنیا کی مہمات" ADVENTURES IN

itsurdu.blogspot.com

WONDERLAND کا شہرہ تھا۔ اسی دور میں ڈپٹی نذیر احمد اپنی بچیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے "مراۃ العروس" لکھ چکے تھے۔ بچوں کے لئے سادہ زبان میں یہ پہلا اصلاحی ناول ہے جس کے کرداران تمام معاشرتی برائیوں اور جہالت پر مبنی مروجہ رسومات کی نشان دہی کرتے ہیں جو صدیوں سے مسلمان معاشرے خصوصاً پردہ نشین خواتین میں عام تھے۔ دوسری اہم کتاب "چند پند" ہے جو انہوں نے اپنے بیٹے بشیر کے لئے لکھی تھی۔ انہوں نے بچوں کے لئے تربیت ۱۸۶۹ء میں "منتخب الحکایات" لکھی۔ بیسویں صدی میں شاید ہی کوئی مسلمان گھرانہ ہو جہاں بچوں کو ڈپٹی نذیر احمد کی کتابیں مہیا نہ کی جاتی ہوں۔ اور آج بھی ان کتابوں کو قبول عام کا مرتبہ حاصل ہے۔

آزاد اور حالی کو بھی اس میدان میں نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ حالی کی نیچرل شاعری خصوصاً موضوعاتی نظمیں بچوں کے لئے ایک پیغام ہیں۔ آزاد نے پنجاب کے ڈائرکٹر تعلیمات میجر فلر کے مشورے پر بچوں کے لئے درسی کتب مرتب کیں، اس کام کے دوران انہیں پہلی بار اس حقیقت کا احساس ہوا کہ بچوں کے لئے ایک متعین زبان لکھنا ایک سخت مسئلہ ہے اور یہ کہ بچوں کے لئے لکھنے والے کو خود بھی بچہ بننا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر جیسے سنجیدہ اور جدید علوم و افکار سے آگاہ نقاد نے آزاد کے اس خیال کو بے معنی قرار دیا ہے۔ غالباً یہ سلیم اختر کا ذاتی خیال ہے نئے علوم اور نفسیات کے تازہ نظریات آزاد کے اصول کی نفی نہیں کرتے ہیں۔ آزاد کے ذہن میں یہ احساس بھی موجود تھا کہ بچوں کے لئے ہلکی شیریں زبان ہی نہیں بلکہ ایسے موضوعات بھی درکار ہیں جو اطراف کے ماحول کی ترجمانی کرتے ہوں، اور بچے اپنے وطن کے جانوروں اور پودوں، درختوں اور دوسری اشیاء سے اچھی طرح واقف ہو سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد نے بچوں کے ادب میں خاکوں اور تصاویر پر توجہ دی۔ اس معاملے میں انہوں نے لاہور آرٹس کالج کے پرنسپل اور معروف انگریزی ادیب رڈیارڈ کپلنگ کے فرزند جان لاک وڈ سے بھی استفادہ کیا۔ گویا صحیح معنوں میں ہمارے یہاں بچوں کے ادب کی روایت کو منظم کرنے کا ابتدائی معرکہ آزاد ہی نے سر کیا۔ بچوں کے لئے انہوں نے نصیحت کا کرن پھول، آئینہ صحت اور قصص ہند لکھیں۔ آزاد

کے ساتھ بچوں کے ادب پر کام کرنے والوں میں ماسٹر پیارے لال کا نام بھی آتا ہے بیسویں صدی کے آغاز سے قیام پاکستان تک کی مدت میں بچوں کے ادب پر جس قدر بھی کام ہوا۔ وہ ڈپٹی نذیر احمد، سرسید، حالی اور آزاد ہی کی روایت کو منعکس کرتا ہے۔

بچوں کے لئے شعری ادب تخلیق کرنے والوں میں اسمٰعیل میرٹھی، حفیظ جالندھری، بے نظیر شاہ، سورج نرائن مہر، تلوک چند محروم، احسن مارہروی، تاجور نجیب آبادی، حامد اللہ افسر، صوفی تبسم، محشر بدایونی، راجہ مہدی علی اور اختر شیرانی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں بچوں کے لئے نثری نگارشات مہیا کرنے والوں میں مولوی ممتاز علی، محمدی بیگم، سید امتیاز علی تاج، رگھوناتھ سہائے، نظر سجاد حیدر، حفیظ، عبدالمجید سالک، عبدالمجید بھٹی، غلام عباس، مولانا چراغ حسن حسرت، ڈاکٹر ذاکر حسین، فیاض حسین جامعی، شفیع الدین نیر، الیاس جیبی، مولانا عبدالواحد سندھی، خواجہ حسن نظامی اور مولانا عبدالحی کے نام تاریخ کا حوالہ ہیں۔

اشاعتی اداروں میں سب سے اہم کردار مولوی ممتاز علی کے دارالاشاعت پنجاب لاہور نے ادا کیا۔ اس ادارے نے اردو میں بچوں کے لئے نہایت معیاری اور بامعنی ادب کی اشاعت کو ممکن بنانے کے علاوہ اس دور کے بچوں کو معمولی سی قیمت پر عمدہ کتابیں فراہم کرنے کے لئے پیسہ لائبریری اسکیم کا آغاز کیا جو بہت کامیاب اسکیم ثابت ہوئی۔ دوسرے نمائندہ اداروں میں فیروز سنز لاہور، شیخ غلام علی لاہور، مکتبہ جامعہ دہلی، تاج کمپنی لاہور، عصمت بکڈپو دہلی، خواجہ حسن نظامی کے اشاعتی منصوبے، حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی اور اشاعت اردو دکن نے اچھے ادب کی ترویج و اشاعت میں حصہ لیا۔ اس پورے دور کا تحریری سرمایہ مواد و معیار کے اعتبار سے اتنا زیادہ عامیانہ اور بازاری نظر نہیں آتا ہے۔ جس قدر کہ اب دکھائی دیتا ہے اس دور کے اشاعتی اداروں نے بہرحال مالی مفادات اور تجارتی مقاصد کی تکمیل کو معیار و مواد پر حاوی نہیں ہونے دیا۔

بیسویں صدی کے اس عرصے میں بچوں کے رسائل کی روایت کو بھی استحکام نصیب ہوا مولوی ممتاز علی نے دارالاشاعت کے زیر اہتمام ۱۹۰۹ء میں پھول جاری کیا۔ پیسہ اخبار کے مولوی محبوب عالم نے بچوں کا ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔ ان رسالوں کے علاوہ تاجور نجیب آبادی

itsurdu.blogspot.com

کا رسالہ پریم رگھوناتھ سہائے کا گلدستہ، عبدالمجید بھٹی کا ہونہار، حکیم احمد شجاع کا نونہال، غنچہ لاہور، مکتبہ جامعہ دہلی کا پیام تعلیم، کھلونا دہلی، انتخاب لاجواب، تعلیم و تربیت اور ہدایت وغیرہ اسی دور کے نمائندہ رسائل شمار ہوتے تھے۔

پاکستان اس اعتبار سے بڑا ہی خوش قسمت ملک ہے کہ یہاں بچوں پر لکھنے والوں کا ایک معتبر ہجوم موجود تھا۔ حفیظ جالندھری، عبدالمجید بھٹی، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، مولانا صلاح الدین احمد، عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر، حکیم محمد سعید، راجہ مہدی علی خاں، محشر بدایونی، شاعر لکھنوی، عبدالواحد سندھی، کمال احمد رضوی، غلام عباس، اے حمید، میرزا ادیب، ابن حسن نگار، سلطان احمد جوجوی، غیاث اقبال، نائل خیرآبادی، مقبول جہانگیر، سید نظر زیدی، عشرت رحمانی، محمود الرحمٰن جو کبھی پرویز کاوی کے نام سے لکھتے تھے۔ اے آر خاتون، ابن انشاء، ڈاکٹر معین الحق، حمید احمد خاں، سراج الدین ظفر، نسیم امروہوی، پروفیسر عبدالسلام خورشید، ندیم صہبائی، جبار توقیر، مسلم ضیائی اور کیتا امروہوی جیسے نام اس دور کے چراغ ہیں۔

سائنس کے شعبے میں علاؤالدین خالد، پروفیسر آفتاب حسن، ناصر زیدی، صلاح الدین احمد اور قاسم محمود کے نام نمایاں ہیں۔ صاحبان فکر و نظر کا یہ قافلہ سرکاری اور قومی سطح پر ہر قسم کے تعاون سے محروم اپنی اپنی انفرادی کوششوں کو بروئے کار لایا۔ اسی دور میں انفرادی توجہ سے بچوں کے لئے رسائل جاری ہوئے۔

دارالاشاعت لاہور کے زیر نگرانی ۱۹۰۹ء سے شائع ہونے والے "پھول" نے تقسیم کے بعد نیا سفر شروع کیا لیکن عمر کے ۴۸ سال پورے کر کے ۱۹۵۷ء میں بند ہو گیا۔ فیروز سنز نے مقبول انور داؤدی کے تعاون سے تعلیم و تربیت جاری کیا جو اب اپنی عمر کے ۳۰ سال پورے کر رہا ہے اور باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔

شیخ غلام علی کا خوبصورت معیاری رسالہ "جگنو" بھی پابندی سے نکل رہا ہے۔ ادارہ جنگ نے ایک رسالہ "بھائی جان" جاری کیا تھا۔ یہ رسالہ اپنے معیار اور حسن و آرائش کے اعتبار سے مقبول ضرور ہوا مگر سفر جاری نہ رکھ سکا۔

حکیم محمد سعید کا ہمدرد نونہال ۲۸ سال سے شائع ہو رہا ہے اور معیار کے اعتبار سے

برابر ترقی کر رہا ہے۔ پھلواری، بچوں کا باغ اور بچوں کی دنیا لاہور سے شائع ہو رہے ہیں۔ کھلونا کچھ دن شائع ہو کر بند ہو چکا ہے۔ کامل القادری نے بڑی محنت اور توجہ سے چہکار جاری کیا تھا لیکن کچھ عرصے کی شاندار اشاعت کے بعد یہ رسالہ بھی زندہ نہ رہ سکا۔ کراچی سے ہونہار اور ٹوٹ بٹوٹ شائع ہو رہے ہیں۔

جامعہ تعلیم ملی کی طرف سے بچوں کا مقبول رسالہ ستارہ عبدالواحد سندھی کی نگرانی میں عرصہ دراز تک شائع ہوتا رہا لیکن حکومت نے تعلیمی اداروں کو تحویل میں لینے کے بعد اس رسالے کی اشاعت کے لئے رقم فراہم کرنے سے انکار کر دیا۔ جس کی بنا پر رسالہ کو بند کرنا پڑا۔ کچھ دنوں سے بچوں کے لئے ایک "کومک سیریل" شائع ہو رہا ہے جو دراصل مغربی تہذیب اور روایات کی نقل کا نمونہ ہے اور انگریزی کو پسند کرنے والے بچوں میں مقبول ہے۔ سندھی میں بچوں کے لئے واحد معیاری رسالہ "گل پھل" باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔

تقسیم کے بعد ذرائع ابلاغ نے بچوں کے ادب اور ان کی تعلیم و تربیت جیسے مسئلے پر کسی پالیسی کے تحت توجہ نہیں دی۔ انگریزی اخبار اور انگریزی ہفت روزہ اشتہار نے البتہ انگریزی سے واقفیت رکھنے والے بچوں پر کام کیا۔ پچھلی دہائی سے اردو اور سندھی اخباروں نے باقاعدگی کے ساتھ بچوں کے لئے صفحات کا اہتمام کیا ہے اور یہ صفحات معیار کے اعتبار سے بتدریج خوب سے خوب تر کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔

ادارہ جنگ نے اب میر شکیل الرحمٰن کی نگرانی میں بچوں کے صفحات کو مزید دلچسپ اور دلآویز بنا دیا ہے۔ بچوں کے لئے ریڈیو کے مختلف مراکز سے نشر ہونے والے پروگراموں میں بتدریج نکھار پیدا ہوا ہے۔

فیروز سنز لاہور، شیخ غلام علی لاہور، تاج کمپنی لاہور اور دارالاشاعت لاہور سے بچوں کے لئے پہلے ہی بہت کچھ شائع ہو چکا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد چند سالوں میں اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ترقی اردو بورڈ، گلڈ اشاعت گھر، ادارہ مطبوعات پاکستان، ہمدرد نیشنل اکیڈمی، مکتبہ فرینکلن، مکتبہ اردو اور جامعہ تعلیم ملی جیسے نئے ادارے منظر عام

itsurdu.blogspot.com

پر آئے۔ ان اداروں کے سامنے بچوں کے ادب کو فروغ دینے کا ایک سنجیدہ پروگرام بھی تھا اور مقصد کے ساتھ خلوص بھی شامل حال تھا۔ چنانچہ انہوں نے اچھا ادب مہیا کرنے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ فیروز سنز اور شیخ غلام علی نے ۵۰ پیسے اور ایک روپیہ والی کتابوں کا جو سلسلہ شروع کیا تھا بہت مقبول ہوا۔

جامعہ تعلیم تی ملیر نے قومی اور اسلامی شخصیات پر بچوں کے لئے کتابوں کا ایک سیٹ شائع کیا۔ ہمدرد اکیڈمی نے گزشتہ چند سالوں میں موضوعات معیار و مقاصد اور آرائش و زیبائش کے اعتبار سے عمدہ کتابوں کا اضافہ کیا ہے۔ مکتبہ فریکلن نے بچوں کے سائنسی موضوعات پر اچھی کتابیں شائع کی ہیں۔ یہی وہ اشاعتی وسائل ہیں جنھوں نے سرکاری سرپرستی نہ ہونے اور تعلیمی تحریک کے نقدان کی فضا میں بچوں کے ادب کو منافع خوری اور تجارتی مفادات کی بے لگام یلغار سے بچائے رکھا۔ لیکن ۱۹۶۰ء کے بعد ہمارے شہروں خصوصاً تجارتی و صنعتی شہر کراچی میں منافع خوری کا رجحان اس شدت سے بڑھا کہ علم و ادب اور تہذیب و معاشرت کا کوئی بھی شعبہ اس کی ضرب سے بچ نہ سکا۔ نظام تعلیم اور علمی اداروں پر افسر شاہی کے تسلط نے ایسی افراتفری اور بے ترتیبی پیدا کر دی اور معروف لکھنے والے بھی علم و ادب میں منفعت کے گوشے (COMMERCIAL VENTURE) تلاش کرنے لگے۔ ملک کے سب سے بڑے صنعتی اور تجارتی شہر سے سر اٹھانے والی وبا کے اثرات بتدریج پورے ملک پر چھا گئے۔ ان حالات میں ناشروں کی بن آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے بازار لچر، عامیانہ سنسنی پیدا کرنے اور محیر العقول قسم کے ادب سے بھرا ہوا نظر آنے لگا۔

ٹیلی ویژن فلموں میں بھاتی فضا۔ انگریزی اقدار کی ہمت افزائی اور اشتہاری فلموں نے ادب کے تاجروں کو نئی نئی راہیں بتائیں۔ ابن صفی کی جاسوسیات بچوں کی زبان میں لکھی جانے لگی۔ والدین، اساتذہ، تعلیمی ادارے اور صاحبان فکر و نظر سب ہی ان رجحانات کے فروغ پر خوش رہے۔ یہاں تک کہ تربیت یافتہ نسل منظر عام پر آئی جو ذہنی و فکری اعتبار سے دیوالیہ اور مغرب پرست ہے اور جس کے لئے ترقی کے معنی ویڈیو، عمارتوں، نائیٹ کلبوں، آراستہ و پیراستہ بازاروں کی تعمیر اور غیر ملکی مصنوعات کی فراوانی ہیں۔

اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے نیشنل بک کونسل اور فاؤنڈیشن جیسے اداروں کا قیام تاریکی میں امید کی کرن ثابت ہوئے۔ ان اداروں نے پہلی بار بچوں کے ادب کی اہمیت اور تاجر پیشہ ناشروں کے نقطہ نظر کو محسوس کیا۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن نے بچوں کے لئے معیاری اور جدید اسلوب سے آراستہ کتابوں کی اشاعت کا ایک منصوبہ تشکیل دیا اور کوشش کی کہ بچوں کے لئے ایسی کتب شائع کریں جو یورپ اور جاپان کے معیار کا مقابلہ کر سکیں۔ ادارے نے قومی تقاضوں اور جدید رجحانات کا خیال رکھتے ہوئے تصاویر، خاکوں اور سرورق کی ڈیزائن اور رنگوں کے امتزاج پر توجہ دی۔ ان کتابوں کی قیمتیں بھی ممکنہ حد تک کم رکھی گئیں۔

ایک اعلیٰ منصوبے کو بروئے کار لانے میں ادارے سے بعض کوتاہیاں بھی سرزد ہوئیں اور اس قسم کی غلطیاں ہر ایسے ادارے کے متعلقین سے ہوتی ہیں، جو سرکاری تعاون سے کام کرتے ہیں۔ اس قسم کی کوتاہیوں کی گرفت کم از کم اس قسم کے اداروں کے لئے ضروری ہے جن کے زیر نظر ایک متعین پالیسی اور مقاصد ہوں اور جن کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہو۔

فاؤنڈیشن کی فہرست میں بعض ایسی کتب بھی ملتی ہیں جن کا معیار پست ہے "سرکس اور شاہدرا" نامی کتاب میں غالب تاثر جرم کا عنصر ہے جو ذوق میں جرائم اور مہماتی رنگ سے انحراف کے بجائے رغبت پیدا کرتا ہے۔ چند کتابوں میں خاکوں، تصاویر اور سرورق ڈیزائن جیسے معاملے میں مغربی روایت کی تقلید پر اکتفا کیا گیا ہے اور یوں اس مقامی ماحول، ارضی مناظر، معنوی شعور کے اثر و نفوذ کو راہ نہیں ملتی جس کی ضرورت ہمارے ملک کے بچوں کو ہے۔

نیشنل بک فاؤنڈیشن نے ان کوتاہیوں کے باوجود بعض قابل قدر کتابیں بھی مہیا کی ہیں مثلاً مہر نگار مسرور کی کتابوں کا سلسلہ حکایات گلستان سعدی۔ نظیر اکبر آبادی کی نظموں کا ایک منتخب مجموعہ "دنیا ایک تماشہ" "چاچا چونچ" مصنف مرزا ادیب، سائنس کا آغاز مصنفہ اکرام قمر۔ اس ادارے کی فہرست میں کشور ناہید کا نام قابل ذکر ہے اس ذکر کو

itsurdu.blogspot.com

مدلل مداحی پر محمول نہ کیجئے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے ایشیائی لوک کہانیوں کے ایک سلسلے کا جو انگریزی زبان میں شائع ہو رہا ہے اور اپنے معیار کے اعتبار سے پوری دنیا میں نمائندہ حیثیت رکھتا ہے، کا ترجمہ بڑی چابک دستی سے کیا ہے یہ سلسلے اردو میں ایک اضافہ ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس سلسلے کی دوسری کتابیں بھی شائع ہوں۔ عالمی بازار میں اس سلسلے کی پانچویں جلد بھی شائع ہو کر فروخت ہو رہی ہے۔ ادارے نے ایشیائی لوک کہانیوں کے دو سلسلوں کو یقیناً بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔

نیشنل بک فاؤنڈیشن کے موضوعات میں بچوں کے کھیل، سائنس۔ تصویری کہانیاں مقامی جغرافیائی اور حیاتیاتی عنوانات مہماتی اور عام کہانیاں، غیر ملکی ادب کے تراجم اخلاقی اور اسلامی کہانیاں اور پاکستان سے متعلق کتب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ادارے کی طرف سے اب تک تقریباً سو رنگا رنگ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

نیشنل بک کونسل ۱۹۶۲ء میں قائم کی گئی تھی۔ اس ادارے نے بھی بچوں کے ادب پر بعض ایسے قابل حوالہ تحقیقی جائزے مکمل کر کے شائع کئے ہیں، جنھوں نے کام کرنے والوں کو فعال رہنمائی فراہم کی ہے ان جائزوں کی اہمیت کا یوں اندازہ ہوتا ہے کہ اب تک ماہنامہ کتاب لاہور نے بچوں کے موضوع پر جس قدر بھی مواد اپنے خصوصی ایڈیشنوں میں شائع کیا ہے۔ اس میں کونسل کے تحقیقی جائزوں سے استفادے کا غالب رجحان نظر آتا ہے نیشنل بک کونسل نے تقریبات اور بعض نظری منصوبوں پر کام مکمل کر کے ان ذرائع و رسائل کو تلاش کیا ہے جو بچوں میں عادات مطالعہ کو فروغ دینے میں موثر کردار ادا کر سکتے ہیں اس مقصد کے لئے ادارہ ہر سال پاکستان کے شہروں کتاب میلوں کا اہتمام کرتا ہے۔ ناشروں اور مصنفوں کو اعلیٰ کارکردگی پر انعامات مہیا کرتا ہے۔

ادارے طرف سے گزشتہ دہائیوں میں جو تحقیقی جائزے شائع ہوئے ہیں۔ ان کی فہرست میں بچوں کے ادب پر ابن انشاء کا وہ مقالہ ہے جو مرحوم نے یونیسکو کے تحت بچوں کے لئے منعقدہ سیمینار میں بمقام تہران پڑھا تھا۔ بعد میں بچوں کے ادب کا جائزہ لینے والوں نے اسی مقالے کے اعداد و شمار اور حوالوں پر اکتفا کیا ہے اس جائزے

کے علاوہ "بچوں میں عادات مطالعہ" "بچوں کے لئے کیا اور کیسے لکھا جائے" اور پاکستان میں شائع ہونے والے بچوں کے ادب کی ایک جامع فہرست قابل ذکر ہیں ان جائزوں سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۷۳ء تک بچوں کے لئے کم و بیش تین سو دو ناولیں، ایک ہزار پچاس سے زائد کہانیوں کے مجموعے، ۵۰ ڈرامے، نظموں اور گیتوں کے تقریباً ۱۰۰ مجموعے، اسلامیات کے موضوع پر ۳۶۰ کتابیں، قومی اور پاکستانی موضوعات پر ۶۰ پر چھپیں، معلومات عامہ پر ۷۰ اور دیگر سائنس پر ۱۰۰ کتابیں شائع ہوئیں۔

اسی طرح ۱۹۷۳ء تک شائع ہونے والی کتابوں کی مجموعی تعداد ۲۴۴۰۲ بنتی ہے۔ ادارے کی طرف سے شائع ہونے والے اعداد و شمار کو فارمولا جان کر اگر ۱۹۷۸ء تک شائع ہونے والی کتابوں کی تعداد کا اندازہ کیا جائے تو یہ کم و بیش ۴ ہزار ضرور ہوگی۔ بچوں کی عادات مطالعہ اور بچے کیا پڑھتے ہیں" جیسے تحقیقی جائزوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان ۴ ہزار کتابوں میں اعلیٰ معیاری اور بامقصد ادب تخلیق کرنے والے معروف ادیبوں کی تصانیف صرف ۲۵ فیصد ہیں۔ ادارہ اپنے ماہانہ رسالہ "کتاب" کے ذریعے عالمی سطح پر بروئے کار لائے جانے والے منصوبوں اور اقوام متحدہ کی کوششوں سے پاکستان کے صاحبان فکر و نظر کو آگاہی بھی فراہم کرتا ہے۔ ان دنوں نیشنل بک کونسل بچوں کے ادب پر جامع کتابیات مکمل کر رہی ہے یہ کتابیات بچوں کے ادب پر کام کرنے والوں، تحقیقی اداروں اور بین الاقوامی حوالوں کے لئے ناگزیر ہوگی۔

بچوں کے ادب میں مقامی ماحول و مناظر تہذیبی پس منظر کو ابھارنے کی جو روایت ۱۹۴۰ء میں "ہیر رانجھا" اور "سوہنی مہینوال" شائع کر کے دارالاشاعت لاہور نے شروع کی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد توجہ سے محروم رہی۔ گزشتہ سالوں میں کامل القادری نے جو مشروع ہی سے بلوچستان کا جغرافیہ، یہاں کے مناظر، یہاں کی تہذیب و ثقافت اور زبان و ادب کا تحقیقی نقطہ نظر سے مطالعہ کر رہے تھے اس اہم پہلو کو گرفت میں لیا اور بلوچستان کی پوری شخصیت کو اپنے ناولوں کا جزو بنا کر بچوں کے لئے "نورا"، "بولان کا خزانہ" اور "خضدار کی مہم" جیسی ناولیں مہیا کیں۔

itsurdu.blogspot.com

نیشنل بک کونسل کے زیر اہتمام ترتیب دیئے جانے والے بچوں کے عالمی سال کی تحریک پر سلیم ناروتی شریف کمال عثمانی اور رئیس فروغ نے بچوں کے لئے اپنی نظموں کے مجموعوں کو شائع کیا ہے اس وقت ملک میں بچوں کا ادب شائع کرنے والے کم و بیش ڈیڑھ سو اشاعتی ادارے کام کر رہے ہیں۔ ۹۸ فیصد اشاعتی ادارے نجی ہیں۔ اور ان کا اصل مقصد حصولِ منافع ہے۔ نئے قائم ہونے والے اشاعتی اداروں میں رنگا رنگ بک کلب تیزی کے ساتھ ابھر کر منظر عام پر آیا ہے۔

رنگا رنگ بک کلب کے زیر اہتمام بعض معیاری کتابیں مثلاً خضدار کی مہم مصنفہ کامل القادری بچوں کے قائد اعظم مصنف افضال احمد، نیل ہرن اور خرگوش کا سپنا مصنفہ کرشن چندر قابل ذکر ہیں۔

پاکستان میں بچوں کا ادب معیار اور مقاصد کے اعتبار سے کس سطح پر ہے اس کا فیصلہ کرنے سے پہلے اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ مجموعی سعی و پیکار کے باوجود حصول زر کی شدید خواہش، شرح منافع میں روز افزوں اضافہ اور معاشرے کی رگ و پے میں سرایت کر جانے والی تجارتی ذہنیت علم و ادب کی طرح بچوں کی علمی و ادبی دنیا پر بھی طفیلی (PARASITE) کی طرح حملہ آور ہو چکی ہے اس صورت حال کے خلاف ہمارے معتبر اشاعتی اداروں کی مزاحمت اور سرکاری و نیم سرکاری سطح پر کی جانیوالی کوششیں بار آور ثابت نہیں ہو رہی ہیں۔ بچوں کے ادب جیسے موضوع پر گزشتہ سال نیشنل بک کونسل نے اظہار رائے کا ایک منصوبہ شروع کیا تھا جو توقع سے زیادہ مفید اور کامیاب ثابت ہوا۔ ملک کے تقریباً تمام معروف ادیبوں نے اس گفت گو میں حصہ لیا۔ ماہنامہ کتاب نے ۱۹۷۸ء اور جنوری ۱۹۷۹ء میں یہ مباحث و مقالات شائع کئے ہیں۔

کونسل کے سرکردہ رکن اور یونیسکو میں پاکستان کی نمائندگی کرنے والے ماہر ابراہیم سعد نے بھی اپنے مضمون مطبوعہ روزنامہ ڈان مورخہ ۵ مئی ۱۹۷۸ء میں بچوں کے ادب کو درپیش مسائل کا تجزیہ پیش کیا ہے۔

زیر نظر جائزہ اسی خیال کی توسیع کرتا ہے کہ ہم نے بچوں کے عادات مطالعہ اور

ذوق کی تربیت کے لئے کوئی شعوری کوشش نہیں کی ہے۔ بچوں کے ادب کو درپیش مسائل پر ماہرانہ رائے دیتے ہوئے ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور علاء الدین خالد نے بعض اہم گوشوں کی نشاندہی کی ہے۔

ماضی میں بچوں کے نام پر جو کچھ شائع ہوتا رہا ہے۔ ناشرین نے اس سلسلے میں مجرمانہ غفلت سے کام لیا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد جو کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں ان کے مواد اور ان کے پروڈکشن کا جائزہ ثابت کرتا ہے کہ پاکستان میں بچوں کا ادب ابھی یورپ کے انیسویں صدی کے دور سے بھی نہیں نکل سکا۔

آج کل پریوں کی کہانیاں، دیوتاؤں کے قصے، غیر حقیقی داستانیں، جاسوسی قسم کے گھٹیا تذکرے مار پیٹ، جوڈو کراٹے کا عام رجحان ہے۔

بچوں کا ادب جن مسائل سے دوچار ہے اس کا صحیح اندازہ اس ماہرانہ تجزیاتی رپورٹ سے ہوتا ہے جو کامل القادری نے ۱۹۷۸ء میں نیشنل بک کونسل کے لئے تیار کی تھی اس رپورٹ میں پاکستانی بچوں نے معاشرے پر جو الزامات عاید کئے تھے ان کی فہرست ذیل میں درج ہے، جو صورت حال کی وضاحت کرتے ہیں:

(الف) عموماً بچوں کی کتابوں کا معیار بہت پست ہے معلومات و اعداد و شمار کی غلطیاں عام ہیں۔ زبان کی سطح کو برقرار رکھنے کی بہت کم ہی کوشش کی گئی ہے۔ اکثر کتابوں کی عبارات ثقیل اور گنجلک ہیں۔

(ب) ابتدائی سرکاری نیم سرکاری اداروں نے (GRADED VOCABUILARY) کی ترتیب و اشاعت پر توجہ نہیں دی ہے۔

(ج) اشاعتی ادارے املا کی یکسانیت کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ عموماً کتابیں کاتب سے لکھوائی جاتی ہیں لیکن سرکاری ادارے اور نیشنل بک فاؤنڈیشن ٹائپ کو فروغ دے رہے ہیں اس قسم کی دورنگی بچوں کے حق میں مضر ہو سکتی ہے۔

(د) ناشرین بلا شبہ حصول زر میں مصروف ہیں کتابیں معروف ادیبوں سے بہت کم لکھوائی جاتی ہیں جبکہ ہمارے ناشر نو آموز لکھنے والوں سے یہ کام چلاتے ہیں۔

itsurdu.blogspot.com

(۱) بچوں کے لئے پبلک لائبریریوں کا کوئی اہتمام نہیں ہے سکولوں کی لائبریریوں میں کتب کی خریداری کا انتظام خواب ہے سڑکوں اور گلیوں کوچوں میں تاجرانہ ذہنیت رکھنے والوں نے لائبریریاں کھول رکھی ہیں جہاں بچوں سے معاوضہ لیکر نہایت پھر اور غیر معیاری کتابیں مہیا کی جاتی ہیں اس قسم کی محلہ لائبریریاں حشرات الارض کی طرح پھیلتی جا رہی ہیں۔

(و) سرکاری سطح پر اب تک کوئی علیحدہ چلڈرن بک فاؤنڈیشن قائم نہیں کیا گیا ہے اس قسم کے ادارے کے زیر نظر حالات میں سخت ضرورت ہے۔

(ز) سرکاری، نیم سرکاری اور قومی سطح پر بچوں کی تعلیم و تربیت کے عدم توجہی کا رجحان قیام پاکستان کے بعد سے ترقی کر رہا ہے اس حقیقت کا ثبوت وہ تحقیقی جائزہ ہے جس کی رو سے ۱۹۷۳ء تک پاکستان کے موضوع پر صرف ۲۰۔ اسلامیات کے موضوع پر کل ۱۰۰، اور قومی موضوعات پر کل ۵۰ کتابیں شائع ہوئی تھیں جبکہ ناولوں اور کہانیوں کی کل تعداد اسی عرصے میں ۱۵ سو تھی۔

نیشنل بک کونسل کی جانب سے مقرر کئے گئے ماہرین نے مئی ۷۸ء کے عام اجلاس میں ان مسائل پر بحث کرتے ہوئے (الف) سے (ذ) تک اٹھائے گئے تمام اعتراضات کے لئے کتابوں کے نمونے بطور سند پیش کئے تھے۔

ان دنوں نیشنل بک کونسل زیر نظر حالات اور بحرانی فضا میں بچوں کے عالمی سال کی تقریبات میں منہمک ہے یہ تقریبات ساری دنیا میں جاری ہیں پاکستان میں بچوں کے عالمی سال کی تقریبات بچوں کے ادب سے متعلق مسائل اور کتابوں کی طباعت و اشاعت جیسے معاملات میں اقوام متحدہ بھی تعاون کر رہا ہے۔ ٹیلیویژن کے علاوہ تمام ذرائع ابلاغ نیشنل بک کونسل کے ساتھ ممکنہ تعاون کر رہے ہیں۔ کونسل کا رسالہ کتاب بچوں کے ادب کی صورت حال اور مسائل و معاملات پر ۱۹۷۸ء سے مضمون جائزے اور بین الاقوامی سطح پر اس شعبے میں ہونیوالی پیش رفت کے متعلق معلومات فراہم کرنے کے علاوہ خصوصی شمارے شائع کر چکا ہے کونسل کے رکن ابراہیم سعد اور کتاب کے مدیر ذوالفقار تابش اور محمد علی چراغ نے اس کام میں انہماک، لگن اور خلوص کا مظاہرہ کیا ہے۔

اردو میں بچوں کا ادب

مجتبیٰ حسین

نہر پر چل رہی ہے پن چکی
دھن کی پوری ہے کام کی پکی

چمکدار کپڑا جو بھایا اُسے
تو ٹوپی میں جھٹ پٹ چھپایا اُسے

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

ان اشعار میں بظاہر کچھ نہیں ہے۔ یہ بے روح بے کار معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں نہ کوئی فکری گہرائی ہے اور نہ جذباتی شدت۔ یہ اردو ادب کی کسی خاص قدیم یا جدید ادبی روایات سے بھی وابستہ نہیں ہیں۔ لفظ اور بیان کے اعتبار سے بھی ان میں کوئی خوبی نہیں ہے — یہ بہت بچکانہ ہیں۔

یہ تمام باتیں صحیح ہیں، خاص طور سے آخری بات کہ یہ بہت بچکانہ ہیں اور یہی ان کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ ان میں بچپن موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ آج بھی ہماری زبان پر جاری ہو جاتے ہیں، ہم جب انھیں پڑھتے ہیں — ہنسی ہنسی میں سہی — تو یہ ہمیں بچپن کی یاد دلا دیتے اور ہماری نظروں کے سامنے اسکول اور مکتب کا وہ زمانہ پھر جاتا ہے جب ہم جماعت میں بیٹھے ہوئے یہ شعر پڑھا کرتے تھے اور ماسٹر صاحب ان کے معنی سمجھانے اور ان کو رٹانے کی کوشش میں مصروف رہا کرتے تھے۔ بچپن کا زمانہ بیت جانے کے

itsurdu.blogspot.com

بعد بھی اس نوع کے اشعار موقع بہ موقع یاد آتے رہتے ہیں۔ یہ نوجوانوں اور بوڑھوں کو بھی یاد رہتے ہیں اور بچوں کو تو خیر یاد رہتے ہی ہیں۔ کسی قسم کی فنی اور فکری خوبی نہ ہونے کے باوجود یہ ماہ و سال کے دھندلکوں سے برابر جھانکتے رہتے ہیں ان میں ایک "یاد رہ جانے والی" کیفیت چھپی رہتی ہے۔ یہی ان کی سب سے بڑی خوبی اور قوت ہے ——— یہ اپنے کو برابر یاد کراتے رہتے ہیں "دیکھو ہم وہی ہیں"! یہ بڑی معصومیت اور نرمی سے ہمیں مخاطب کرتے رہتے ہیں اور ہم ذرا دیر کے لئے اپنی سنجیدگی سے منہ موڑ کر ان کی طرف پیار سے دیکھنے لگتے ہیں، اور گود میں اٹھا لیتے ہیں۔ ان اشعار میں یہ مخصوص کیفیت جو پائی جاتی ہے۔ یہی بچوں کے سارے اچھے ادب میں ملتی ہے۔ اور اسی لئے جب ہم بچوں کے ادب کے بارے سوچتے ہیں تو وہی چیز سب سے پہلے ہمارے ذہن میں آتے ہیں جن میں یہ عنصر پوشیدہ رہتا ہے۔ بچوں کے ادب کے سلسلے میں یہی "یاد دلانی" والا عنصر مواد اور ہیئت کو متعین کرتا ہے۔ بچوں کے ادب میں مواد اور ہیئت کی نوعیت ذرا مختلف ہوتی ہے۔ موضوع کی افادیت یوں تو ہر قسم ادب میں مسلم ہے مگر بچوں کے ادب میں یہ افادیت انتہائی نازک مسئلہ بن کر سامنے آتی ہے۔ یہاں موضوع کی فکری گہرائی اور جذباتی لطافت پر اتنا زور نہیں دیا جاتا جتنا موضوع کے بعض ایسے پہلوؤں کے انتخاب پر جو آسانی سے ذہن میں رہ جائیں۔ یہ کام بہت محنت طلب ہے اور اس میں اتنی ہی علمی اور ادبی کاوش کی ضرورت پڑتی ہے۔ جتنی کسی علمی یا ادبی تخلیق کے سلسلے میں۔ بچوں کے ادیب کو اس موقع پر دوہری ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے پہلی ذمہ داری تو ایسے موضوع کا انتخاب ہے جو بچوں کے سن و سال سے ہم آہنگ ہو۔ اس کے بعد اس مخصوص موضوع کے بھی صرف چند ایسے پہلوؤں کو ایسے زاویوں سے پیش کرنا ہوتا ہے جو بچہ اچھی طرح سمجھ لے اور ذہن میں بڑی حد تک نہ سہی تو کچھ حد تک محفوظ کر سکے۔ مواد کے سلسلے میں اسی "انتخاب" کو اولیت ہے۔ اچھے سے اچھا اور مفید سے مفید موضوع اگر پوری احتیاط اور سوجھ بوجھ سے منتخب نہیں کیا گیا تو بچے کے لئے بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے برعکس بڑے سے بڑا موضوع بھی بچے کے حلق سے اتارا جا سکتا ہے اگر اس میں ان تمام امور کو مدنظر رکھا گیا ہے جو بچے کی ذہنی اور جذباتی زندگی سے "میل" کر سکتے ہیں۔

موضوع کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ بچوں کو "دوست" بنا سکے اور بچے اسے "دوست" بنا سکیں۔ اور ساتھ ہی موضوع کو بہر طور بچوں کو بُرے دوستوں سے بچانا بھی چاہیئے ——— یہیں پہنچ کر ایک اور اہم مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ ہے نفسیات کا۔ بچوں کے ادیب کے لئے نہ صرف بچوں کی نفسیات کا مطالعہ اور اس سے واقفیت ضروری ہے بلکہ اپنے زمانے کی نفسیات کا بھی اسے شعور ہونا چاہیئے۔ اور دونوں صورتوں میں اس شعور کی بنیاد صحت مند اقدار پر رکھے بغیر بچوں کی رہنمائی ممکن نہیں ہے۔ بچوں کی نفسیات کو سمجھنے کے لئے ادیب کو خود بچہ بننا پڑتا ہے۔ یہاں صرف مطالعہ اور فرض کے احساس سے کام چلانا خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ اس میں دلچسپی اور شدید احساس قربت کے بغیر بچے کے دل و دماغ میں گھر کرنا محال ہے۔ اس کے علاوہ بچوں کے ادیب کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ وہ اپنے عہد کے مطالبات اور ان کے نفسیاتی جوازسے بھی باخبر ہو۔ طلسم ہوشربا، الف لیلیٰ، قصہ چہار درویش اور اس قسم کی متعدد کتابیں بچوں کے لئے آج بھی بہت دلچسپ ہیں۔ مگر آج کا ادیب اگر ان کتابوں کے انداز میں لکھنے کی کوشش کرے گا تو اس کی یہ کوشش نہ صرف یہ کہ نقالی ہو گی بلکہ غیر مقبول بھی۔ اس میں شک نہیں کہ بچوں کا ادب بچوں کو کہانیاں سناتا ہے مگر آج کے ادیب کو اپنے ماحول کی نفسیات اور زمانے کے مطالبات سے اتنی واقفیت ہونی چاہیئے اور خود پر اور بچے پر اتنا اعتماد ہونا چاہیئے کہ وہ یہ محسوس کر سکے کہ جن اور پریوں کی کہانی آج خود بچوں کو زیادہ پسند نہیں رہیں۔ الف لیلیٰ کو تو بچہ قبول کر لے گا۔ لیکن آج اگر الف لیلوی اقدار اور روایات کے ماتحت کہانیاں لکھی گئیں تو بچہ اسے آسانی سے شاید قبول کرنے پر تیار نہ ہو سکے وہ اسے جھوٹ اور بڑی حد تک بے اس سمجھے گا (کم از کم وہ بچہ جو کہانیوں کی کتابیں پڑھنے لائق ہو گیا ہے) اور یہاں اسی عمر کے بچے سے بحث ہے۔ اسی لئے بچوں کے ادیب کو روایتی ماحول، رجعت پسند اقدار اور بے معنی اور بے سروپا افسانہ طرازی سے بچنے کی آج جتنی ضرورت ہے اتنی اس سے پہلے نہیں تھی ——— آج کے بچے نے سائنس کے دور میں آنکھیں کھولی ہیں ——— اسے یاد رکھنا ہر اس ادیب کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا یہ یاد رکھنا کہ وہ بچوں کے لئے لکھ رہا ہے اس دوہری مزاج شناسی کے بغیر مواد کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اور نہ ایسا ادب

itsurdu.blogspot.com

پیدا ہو سکتا جو بچوں کے ذہن میں رہ جائے ـــــ اور جسے پڑھ کر بچے خوش ہو سکیں۔ بڑوں کے لئے جو ادب ہوتا ہے، اس کا کام بھی آدمیوں کو خوشی دینا ہے ـــــ اور بچوں کے ادب کا بھی یہی کام ہے۔

یہی دو مسئلے اسلوب کا سوال بھی اٹھاتے ہیں، مواد کے انتخاب کا اور مزاج شناسی کے ساتھ ساتھ الفاظ کے انتخاب کا سوال بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ لفظ اور بیان کی اہمیت بچوں کے ادب میں موضوع سے کسی طرح کم نہیں ہے ـــــ اسی لئے کہ یہی الفاظ اور ان کی ترتیب بچوں سے رسم و راہ بڑھانے میں سب سے پہلے مدد لیتی ہے۔ یہ بات تو عام طور سے سب جانتے ہیں کہ بچوں کے ادب کے سلسلہ میں الفاظ سیدھے سادے اور آسان ہوں۔ انداز بیان صاف اور سلجھا ہوا ہو، لیکن بات صرف اتنی ہی نہیں ہے ـــــ زود فہمی کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ الفاظ بچوں کی عمر کے تقاضوں سے ہم آہنگ بھی ہوں۔ ایسی صورت میں اگر جابجا مشکل الفاظ بھی آجاتے ہیں تو بچے اس کو بخوشی قبول کر لینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں ـــــ اور وہ ان کے ذہن میں گونجتے رہتے ہیں ـــــ ان کی ترتیب اور ان کا آہنگ ان کی یاد کو تازہ کرتا رہتا ہے لیکن اگر الفاظ بچوں کے مزاج اور ان کی عمر کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہو لے تو آسان سے آسان لفظ اور صاف سے صاف انداز بیان بھی ان کے ذہن میں محفوظ نہیں رہ پاتا۔ مثال کے طور پر اشعار کے سلسلے میں صرف آسان لفظوں اور موزونیت کی شرط ہی کافی نہیں ہے۔ فرض کر لیجئے کہ یہ ایک شعر ہے ؎

اکبر، بہتر، تہتر، چوہتر ـــــ پچھتر، چھتر، ستر، اٹھتر

اور اسے آپ کسی بچے کو بطور شعر کے سناتے ہیں اور یہ بھی امید رکھتے ہیں کہ اس کی نادانی اور کم سنی سے فائدہ اٹھا کر آپ اس کے دل میں یہ بٹھا سکیں گے کہ یہ صحیح معنوں میں ایک شعر ہے۔ اس امتحان میں غالباً آپ کبھی بھی پوری طرح کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ ممکن ہے بچہ اسے ایک نیا "شعری کھیل" سمجھ کر خوش ہو جائے ـــــ مگر وہ اسے ایک "چھوٹا شعر" اور "کھیل" ہی سمجھے گا۔ آپ اسے مشکل سے یقین دلا سکیں گے کہ یہ بھی ایک شعر ہے اگرچہ اس میں جتنے الفاظ ہیں وہ بچہ روز گنتی میں پڑھتا ہوگا ـــــ یہ سب کے سب جانے بوجھے ہیں۔ آسان ہیں

اور موزوں بھی کر دیئے گئے ہیں۔ اس کے برخلاف اسی بچے کے سامنے اقبال کا وہ شعر پڑھ دیجئے ؎

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

آپ پورا شعر بھی نہ پڑھ پائیں گے اور وہ اس کے مصرعوں کو اٹھا لے گا ـــــ اس شعر میں بعض لفظ جیسے شمع، صورت وغیرہ اور انداز بیان "دعا بن کے تمنا میری" آسان نہیں ہے اور نہ اتنا سلجھا ہوا ہے۔ مگر بچہ اسے قبول کرنے پر تیار ہو جائے گا۔ اسی طرح اقبال کا یہ شعر لے لیجئے ؎

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

اس شعر میں الفاظ۔ اضافت اور تشبیہ سب مشکل ہے مگر بچوں کی زبان پر یہ شعر بھی جاری رہتا ہے۔ یہاں ممکن ہے کہ یہ بات کہی جائے کہ بچوں کو اس قسم کے اشعار اس لئے یاد رہتے نہیں کہ رٹائے جاتے ہیں ـــــ یہ بات کچھ وزن ضرور رکھتی ہے ـــــ مگر قصہ صرف یہی نہیں۔ بات آگے بھی پہنچتی ہے۔ سیکڑوں، ہزاروں رٹائے ہوئے اشعار میں سے صرف اسی قسم کے اشعار کیوں یاد رہ جاتے ہیں ـــــ آخر دن گذر جانے کے بعد بھی یہ اشعار کیوں زبان پر آجاتے ہیں!! بچہ جب دوسرے درجہ میں پہنچ جاتا ہے تو بھی اس نوع کے اشعار اس کے حافظے میں کیوں باقی رہتے ہیں!! اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ الفاظ اور انداز بیان کے لحاظ سے سادہ اور آسان نہ ہونے کے باوجود یہ اشعار بچے کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں، ان کا آہنگ، ان کی موسیقی، ان کی نرمی، ان کے الفاظ کی بندش اور اس بندش سے پیدا شدہ نفسیاتی تجسس اور تحیر، اور ایک مجموعی خوشنمائی اور نئے پن کا تاثر بچے کو شدت سے بھلا لگتا ہے اور اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اسی لئے بچوں کے ادب میں لفظ و بیان کے مسئلے کو صرف آسانی اور صفائی تک محدود کر دینا "بچے" کو بالکل "بچہ" سمجھ لینا ہے اور کوئی بھی ادیب جب بھی اپنے قاری سے اس "رویے" کے ساتھ مخاطب ہوتا ہے۔ خواہ اس کا قاری بڑا ہو یا بچہ تو اس کا قاری اس کے بارے میں زیادہ

itsurdu.blogspot.com

اچھی رائے مشکل ہی سے قائم کر پاتا ہے۔

بچوں کے ادب کے بارے میں اس مختصر سی بحث کے بعد جب ہم اردو ادب پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں یہاں بہت کم سرمایہ ایسا ملتا ہے جسے ہم صحیح معنوں میں بچوں کے ادب سے تعبیر کر سکیں اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اردو ادب دنیا کے دوسرے بڑے ادب کے مقابلے میں خود بہت کم سن ہے اس کی جب آنکھ کھلی تو دنیا کے ادب اپنی تمام بزرگی کے ساتھ سر پر موجود تھے۔ اردو ادب نے ان کے بچپن کو نہیں دیکھا۔ وہ ان کے ساتھ کھیل نہیں سکا۔ اسی لئے وہ ان کی بزرگی سے متاثر ہوا۔ ان کے بچپن سے نہیں۔ یہ دوسری زبانوں کے بڑے ادب کے برخلاف فطری طور پر اپنے بچپن کے دور سے نہیں گزرا۔ یہ بہت جلد جوان ہو گیا۔ ادب بھی انسانوں کی طرح بچپن کے دور سے گذرتا ہے۔ وہ بھی شروع شروع میں کہانیاں بڑے شوق سے سنتا ہے اور دوسروں کو سناتا ہے۔ مگر اردو ادب کو یہ زمانہ ہی نہیں ملا۔ اسے اپنے ابتدائی دور میں ہی جن شاعروں اور ادیبوں سے سابقہ پڑا وہ اکثر و بیشتر خود دوسری زبانوں کی عظمت اور بزرگی سے واقف اور دلدادہ تھے اور اسی بزرگی کے حامل بھی تھے۔ دوسری وجہ یہ کہ جب ہمارے ادیبوں نے ادھر کا رخ کیا بھی تو چند خیالی کہانیوں کے سوا اور کچھ نہیں لکھا۔ یہ کہانیاں بہت دلچسپ ہونے اور ایک حد تک تصورات کو وسعت دینے کے باوصف بھی نہ زیادہ تعداد میں لکھی گئی ہیں نہ زیادہ "پرمایہ" ہیں۔ ان میں سے بیشتر دوسری زبانوں سے ماخوذ بھی ہیں۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ بعض وہ ادیب جو بچوں کو واقعی کچھ دے سکتے تھے چند نظموں اور افسانوں کے بعد بڑوں کے ادب کی طرف متوجہ ہو گئے۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ بچوں کے ادب کے لئے جس قدر جاگا ہی اور غور و فکر کی ضرورت ہے اور اس کے تمام مطالبات کو جو انتہائی نازک اور مشکل ہیں۔ پورا کرنے کی شرط ہے۔ اس کی طرف ہمارے کسی ادیب نے اب تک توجہ نہیں دی ہے۔

ان تمام کمزوریوں اور کوتاہیوں کے ہوتے ہوئے بھی اردو ادب میں بچوں کے ادب کا بالکل ہی کال نہیں ہے۔ اگر ہم اس کا بھی ایک سرسری سا جائزہ لے لیں تو اردو ادب میں بچوں کے ادب کا یہ خاکہ کچھ اور اجاگر ہو جائے گا۔ اس ضمن میں پرانے شاعروں اور ادیبوں میں صرف نظیر اکبر آبادی اور میر امن ہی کا نام لیا جا سکتا ہے جن کی بعض تخلیقات یا تخلیقات کے بعض

حصے بچوں کے لئے ہیں یا جن سے بچے دلچسپی لے سکتے ہیں۔ رجب علی بیگ سرور کا فسانہ عجائب صرف بوڑھے بچوں کے لئے ہے۔ وہاں بچوں کی رسائی ناممکن ہے۔ نظیر اکبر آبادی کے پورے کلام میں زندگی سے لطف لینے کی جو صلاحیت ہے وہی ان کی شاعری کو بچوں کے لئے بھی گوارا بنا دیتی ہے۔ ان کے کلام میں ایک اچھل کود، ایک ولولہ اور سیر تماشہ کا جذبہ شروع سے آخر تک پایا جاتا ہے۔ وہ مختلف مناظر اور چیزوں کو دیکھ کر خود بھی خوش ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی خوش کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ بچوں کے لئے نظمیں لکھتے ہیں۔ جیسے "ریچھ کا بچہ" اور "ہنس" وغیرہ تو بچوں میں بالکل گھل مل جاتے ہیں ——— وہ لفظوں سے اسی طرح خوش ہوتے ہیں جس طرح بچے اپنے اپنے کھلونوں سے ——— بہت بڑی حد تک وہ خود اپنی شاعری میں "بچے" کی شکل میں نظر آتے ہیں ——— ان تمام چیزوں کی وجہ سے ان کی نظمیں بچوں کے دلوں میں گھر کر لیتی ہیں۔ پھر چہار درویش میں میر امن بھی "سیر و سیاحت" کے شوق کو جس طرح ہوا دیتے ہیں وہ بچوں کے ذوق تجسس کو کافی ابھار سکتا ہے مگر "چہار درویش" میں زبان کی سادگی اور مٹھاس کے باوجود زیادہ حصے ایسے نہیں ہیں جو بچوں کو پوری طرح لبھا سکیں۔ نظیر کی شاعری میں معصومیت ہے اور میر امن کے چہار درویش جہاں دیدہ ہیں۔ اسی لئے زیادہ عرصہ تک بچوں کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ان کے بعد عرصہ تک اردو ادب میں بچوں کے لئے کوئی قابل ذکر تخلیق نہیں ملتی، یہاں تک کہ ہم آزاد اور حالی کے دور میں آجاتے ہیں ——— اس دور میں شاعری کے ساتھ ساتھ نثر کی اہمیت پہلی بار محسوس ہونے لگتی ہے اور نثر اتنی ہی وقیع ہو جاتی ہے جتنی شاعری سمجھی جاتی رہی ہے۔ مغلیہ سلطنت کا زوال، غدر، انگریزوں کا تسلط ——— زندگی کے حل طلب، ٹھوس مسائل، مغربی اثرات، بڑھتی ہوئی سماجی بیداری، ان تمام عناصر نے مل کر نثر کی اہمیت کو مسلم کر دیا۔

چنانچہ آزاد نے نظم کے علاوہ نثر میں بھی بچوں کے لئے بیش قیمت کتابیں لکھی ہیں۔ "نصیحت کا کرن پھول" اور "قصص ہند"۔ موخر الذکر کی کامیاب ترین تخلیقات میں سے ہے بچوں میں تاریخی ذوق پیدا کرنے کے سلسلے میں غالباً اب تک ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ حالی نے بھی بچوں کے لئے کئی چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھی ہیں۔

itsurdu.blogspot.com

آزاد اور حالی کے بعد بڑھتے ہوئے سماجی شعور کی وجہ سے بچوں کی طرف توجہ بھی بڑھنے لگی اور متعدد ادیبوں اور شاعروں نے نظمیں اور کہانیاں لکھنی شروع کیں ـــــ مگر شاعری کے سلسلے میں اسمٰعیل میرٹھی سے کوئی اب تک بازی نہ لے جا سکا ـــــ وہ بچوں کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ انہوں نے ان کے لئے بے شمار نظمیں لکھی ہیں جن سے ہم سب واقف ہیں ـــــ اور جنھیں ہم سب پڑھ چکے ہیں۔

اسمٰعیل میرٹھی صحیح معنوں میں بچوں کے شاعر ہیں ان کی شاعری میں بلندی نہیں ہے۔ فلسفہ نہیں ہے۔ ادبی چاشنی نہیں ہے ـــــ مگر ان کی نظموں میں ایک چیز ہے ـــــ اور وہ ہے بچپن! ان کی نظموں میں یہی سب سے بڑی تازگی ہے۔ اسی لئے آج عمر کی ہر منزل میں ان کے اشعار یاد آجاتے ہیں اور بچوں کی تمام درسی کتابوں میں ان کی نظمیں مل جاتی ہیں۔ ان کے بعد اور کئی شاعروں اور ادیبوں نے ادھر توجہ کی جن میں افسر میرٹھی، حفیظ جالندھری، راشد الخیری، امتیاز علی تاج کے نمایاں نام ہیں۔ مگر اس دور میں بچوں کے ادب کے سلسلہ میں اقبال کا نام سب سے اہم ہے ـــــ جس طرح ان کا نام اعلیٰ شاعری کے سلسلے میں بڑا ہے اسی طرح بچوں کے لئے جو شاعری انہوں نے کی ہے وہ کافی اہم ہے۔ اگرچہ انہوں نے بچوں کے لئے بہت کم لکھا ہے۔ مگر جتنا بھی لکھا وہ ہر بچے کی زبان پر ہے ـــــ اقبال بچوں کی بزرگی سے پوری طرح واقف تھے۔ یہی وجہ ہے ان کا کلام بچوں کو پوری طرح اپنا سکا ہے ـــــ

اقبال کے بعد اور انہی کے زمانے سے بچوں کے ادب کا سلسلہ چل نکلتا ہے۔ اور بے شمار نظمیں اور افسانے اس ضمن میں تخلیق کئے جا چکے ہیں اور برابر لکھے جا رہے ہیں۔ اب بچوں کے لئے کئی رسالے بھی نکلنے لگے ہیں۔ یہاں تک کہ بچوں کا ادب ایک تجارتی پہلو بھی بنتا جا رہا ہے ـــــ جس کی طرف فوری توجہ ضروری ہے ـــــ بڑوں کے ادب کا تجارتی پہلو اتنا مضر اور مہلک نہیں ہے جتنا بچوں کے ادب کا۔ بڑے تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ اپنا مذاق خراب کر لیں گے ـــــ مگر یہ بچوں کے ادب والے تجارتی رسالے تو نسل کی نسل کو تباہ کر دیں گے ـــــ اور اب صورت حال یہ ہے کہ رسالے تو رسالے بچوں کے منھ نکلنے لگے

ہیں ـــــ!! ہمارے ادیبوں کو اگر اپنے ادب سے فرصت ملے تو اس طرف توجہ ضرور دینی چاہیئے۔

بچوں کے ادب کا یہ مختصر سا جائزہ اتنا ہی تشنہ ہے جتنا اردو میں بچوں کا ادب ـــــ لیکن اگر اس نے ہمارے ادب میں دوسروں کو اس مسئلہ کی اہمیت کا ذرا بھی احساس دلایا تو شاید اس کا کوئی نہ کوئی حل نکل آئے۔

ہمارے ادب میں ابھی وہ ادیب نہیں پیدا ہوئے ہیں ـــــ جو عظیم المرتبت ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر نفسیات بھی ہوں ـــــ اور بچوں سے دوستی کر سکیں۔ ابھی بچوں کا ادب کوئی سعدی ـــــ کوئی (DANIEL DEFO) نہیں پیدا کر سکا ہے ـــــ اردو ادب اور بچے دونوں اس کے منتظر ہیں؟

---

itsurdu.blogspot.com

پنجابی لوک ادب اور بچے

شہباز ملک

پنجابی میں بچوں کے ادب کی نوعیت تین قسم کی ہے۔ پہلی قسم میں وہ ادب آتا ہے جو بچوں کے بارے میں ہے۔ یہ بڑوں نے تخلیق کیا ہے اس میں بچوں نے حصہ نہیں لیا۔ یہ بچوں کی معاشرے میں اہمیت وغیرہ کے بارے میں ہے۔ لیکن اس میں وہ ادب بھی شامل ہے جو بچوں کے بارے میں بڑوں کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ یا وہ ادب جو بچوں کے لئے لکھا جاتا ہے اس میں ایک لحاظ سے بچے حصہ لیتے ہیں اس ادب میں لوریاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ تیسری قسم میں وہ لوک ادب آتا ہے۔ جن کی تخلیق میں وہ بچے حصہ لیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کو ادب کا درجہ دینے میں بڑے بھی خاص معاونت کرتے ہیں۔

پہلی قسم جو ادب بچوں کے بارے میں مذکور ہوا ہے اس میں پنجابی کے اکھان (کہاوت) اور مختلف لوک گیت آتے ہیں۔ یہ ادب ادبی لحاظ سے پختگی لئے ہوئے ہوتا ہے۔ مثلاً کہاوتوں میں لوک دانش کا اظہار بڑے پُر اثر طریقے سے ہوتا ہے۔ چند کہاوتیں درج ذیل ہیں:

۱۔ بچے کے سر پر گھاس نہیں اگتی، باقی سب کچھ ہو سکتا ہے۔

۲۔ اس ماں کا بچہ کھیل سکتا ہے جو پیسہ خرچے۔

۳۔ بچے کی ماں نہ مرے اور بوڑھے کی جورو۔

۴۔ لڑکے پیدا ہوتے ہی جوان ہوتے ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ ادب بچوں کے بارے میں ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں۔ جو سینہ بہ سینہ بچوں کے بارے میں سچائیوں کے سیاق و سباق میں کہی گئی ہیں اسی طرح ایک قسم لوک گیتوں کی ہے جن میں بچوں کے بارے میں معاشرے کے دوسرے افراد کے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔

بچوں کی پیدائش پر خاص طور پر لڑکے کے جنم پر ہمارے ہاں بہت خوشی منائی جاتی ہے اسی لئے ہمارے ہاں کی سب سے بڑی دعا "دودھیں نہائیں تے پتیں پھلیں" ہے اس طرح بہن بھائی کا پیار بھی یہاں مثالی شے ہے۔ ایک بہن اپنے بھائی کے گھر لڑکا پیدا ہونے کی خبر سنتی ہے تو اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتی ہے ؎

باپ کے گھر کے صحن میں مہتاب ابھرا اور بھائی کے گھر لڑکا پیدا ہوا

ایک بہن اپنے چھوٹے بھائی سے اس قدر محبت کرتی ہے کہ تمام عمر اس کو کھلاتے رہنے میں گزار دینا چاہتی ہے۔

چھوٹے بھائی کی نوکرانی بن کر اپنی ساری عمر گزار دوں

لوک ادب کے اس حصے کی یہ تھوڑی سی جھلک ہے جس کا موضوع بچے ہیں۔ اب آیئے بچوں کے ادب کی طرف! اس ادب کا ایک حصہ وہ ہے جس کا تعلق بچے کی اس عمر کے ساتھ ہے، جب وہ خود بولنا نہیں سیکھتا۔ اس ادب کی تخلیق میں بھی بڑے ہی حصہ لیتے ہیں لیکن اس کی سطح بچوں کی سوچ کی سطح سے زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ ہوتی ہے اس میں لوریاں اور "بھولنے" کے گیت قابل ذکر ہیں۔

"لوری" ایک ایسا دعائیہ گیت ہوتا ہے جو دودھ پیتے بچے کو عموماً روتے کو چپ کرانے، بہلانے یا سلانے کے لئے گایا جاتا ہے اس کے لئے "مدھم" بول عام فہم ہوتے ہیں۔ اس میں بچے کی عمر، اچھی صحت، اس کے سگے رشتہ داروں کی خیر کی دعا ہوتی ہے۔ بعض لوریوں میں معاشرتی حقیقتوں کا بیان بھی آ جاتا ہے، لوریاں عام طور پر نانیاں، دادیاں مائیں، بڑی بہنیں وغیرہ گاتی ہیں۔ بچے کو جھولے میں ڈالکر، گود میں لے کر یا چارپائی پر ٹھاکر ہلکی ہلکی تھپکی سے لے، کا کام لیا جاتا ہے۔

تو ہی اللہ تو ہی والی ہے
تو نے ہی دنیا دیا ہے تو ہی پالے گا
کتے دور ہو جا۔ جا جنگل میں سو
جنگل میں کانے۔ بچے کے ماموں جیئیں

itsurdu.blogspot.com

ماموں نے تہبند باندھ رکھی ہے۔ بچے کے چچا جئیں
چچوں نے دعا دی ہے بچے کے بھائی جئیں

جب بچہ تھوڑا سا بڑا ہوتا ہے۔ منہ سے آوازیں نکالنے لگتا ہے۔ گھٹنوں پر چل کر ماں، دادی، تائی یا بہن کے پاس جاتا ہے کہ وہ اسے کھلائیں تو اس موقع پر "ہونٹے مانیاں" کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ چارپائی پر چت لیٹ کر ٹانگیں پیٹ کے ساتھ لگائی جاتی ہیں ان پر بچے کو بٹھا کر اوپر نیچے کیا جاتا ہے۔ یہ ایک قسم کا جھولا بن جاتا ہے۔ ساتھ ساتھ جو گیت گایا جا رہا ہے اس کے بول یوں ہیں:

جھولا جھلاؤں
پینگھ پر خروزے جھولیں ڈھائی سیر ہو کر
آدھے کا میں نے نمک منگوایا اور آدھے کا میں نے تیل
بوڑھی اماں اپنے برتن وغیرہ سنبھال لینا
بارش کا ریلا آ گیا ہے

"بارش کا ریلا آ گیا ہے" کہتے ہوئے جھلاتے جھلاتے ٹانگیں بالکل اوپر کو سیدھی کر دی جاتی ہیں۔

بچے کو بہلانے اور خوش کرنے کا ایک اور طریقہ بھی ہے اس کو "کتکتاریاں" (گدگدیاں) کہتے ہیں۔ یہ "ہونٹے ماہیاں" لینے والے بچے کی عمر سے ذرا بڑی عمر کے بچے کے لئے ہوتی ہیں۔ اس عمر میں بچہ خود بھی "تت بت" کرنے لگتا ہے۔ بچے کو سامنے بٹھا کر اس کا ایک بازو پکڑ لیتے ہیں۔ مندرجہ ذیل بولی کہتے ہوئے پہلے ہاتھ پھر درمیان اور پھر بغل میں گدگدی کرتے ہیں ؎

یہاں پر چوری بنائی
گھی ڈالا
چینی ملائی
بچے نے کہا

بچے نے چوری کھالی

ابتدائی عمر میں بچے جھولے کے بہت شوقین ہوتے ہیں۔ لوری کے وقت یا ہونٹے ماہیاں کے وقت، وہ یہ مزہ چکھ چکے ہوتے ہیں اس لئے جب ذرا کھیلنے کودنے کے لائق ہوتے ہیں تو جھولے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ جھولے لکڑی کی پٹڑیوں کے ایک گول چکر کی صورت میں اوپر سے نیچے یا دائیں بائیں چلتا ہے۔ جھولے والا جب جھولا لاتا ہے۔ تو بچے کھچے چلے جاتے ہیں۔ جھولے پر بیٹھ کر اسے زیادہ سے زیادہ تیز جھولا چلانے کے لئے کہتے ہیں:

بھائی - بھائی - بھائی
تیری تیل کی کڑاہی
تیرے نمک کا تباشہ
تیری بیوی کرے تماشہ
ہم مسکراتے ہیں بھائی زور سے

اسی عمر میں بچے کا رجحان کھیل کود کی طرف بہت زیادہ ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ جھولے سے ملتا جلتا ایک کھیل "ہاں بھاں بلیاں" ہے جب اسے جھولا میسر نہیں ہوتا تو یہ کھیل کھیلتا ہے یہ کھیل بچے مل کر کھیلتے ہیں۔ طریقہ یہ ہے کہ بچے اپنے دونوں ہاتھ کندھوں کے برابر پھیلا لیتا ہے اور اپنے پاؤں پر ہی لٹو کی طرح گھومنا شروع کر دیتا ہے۔ ساتھ ساتھ یہ گیت گاتا ہے:

بھاں بھاں بلیاں — مرغوں کی قطاریں
مرغ گیا جنگل
وہاں پائی زنجیر
زنجیر کی کڑیاں
بھوں بھوں ٹریں

یہ کھیل بچے مل کر بھی کھیلتے ہیں جب چکر چڑھ جاتے ہیں تو گرتے ہیں۔ ہنستے

itsurdu.blogspot.com

ہیں چکر اترتے ہیں تو ایک بچہ کہتا ہے اب "پچھ" کھیلیں۔ سارے ایک دائرے میں کھڑے ہو جاتے ہیں ایک بچہ بولتا ہے:

میری بھابی نے مرچیں پیسیں
مجھ کو آئی چھینک، پچھ، پچھ

"پچھ" کے ساتھ سارے بچے، سچ مچ چھینک کی طرح کرتے ہیں یہ سلسلہ ان کے تھک جانے تک جاری رہتا ہے۔ دائرے میں کھیلے جانے والے کھیلوں میں ایک اور کھیل بھی ہے دائرے میں بچے کھڑے ہو کر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں پھر دائیں یا بائیں چلنا شروع کر دیتے ہیں ساتھ ساتھ بول بولتے ہیں۔ آہستہ آہستہ رفتار تیز کرتے جاتے ہیں اور گیت کے آخری بول تک رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے گیت ملاحظہ کریں:

ہمارے صحن میں پیپل تھا بھئی پیپل تھا
ایک پتہ توڑیں گے جو تمام پتے ہلیں گے
سارے ماموں آئیں گے۔ بڑھ چڑھ کے آئیں گے
ایک ماموں ترس گیا۔ اس کو دی پیڑھی
نیچے سے کاٹ گئی چیونٹی
بھیا بھیجری کا، دیکھ تماشہ چیونٹی کا، دیکھ تماشہ چیونٹی کا
گرم گرم پکے ہیں چاول
اوپر ڈالی چینی
بھائی میرے کی بیٹھی آئی
سکوں ملا، کلیجہ کو۔ سکوں ملا، کلیجہ کا

پگھوڑے سے جھولے تک آنے میں بچے کی عمر سوچ اور جسمانی حالت میں خاص فرق پڑ جاتا ہے۔ اب بچہ خود کھیلنے کودنے اور کھیل کود میں نت نئی اختراعیں کرنے کے قابل ہو جاتا ہے چنانچہ بلوغت تک پہنچنے تک اس کا یہ زمانہ کھیل کود اور بول بلاری میں گزرتا ہے۔ اس کے ابتدائی حصے کے کھیل کود اور پھر بلاریاں لڑکیوں اور لڑکوں میں

مشترک ہوتی ہیں اور پھر آہستہ آہستہ علیحدہ علیحدہ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ مشترکہ کھیلوں میں ذکر کئے کھیل کھیلوں اور بولوں کے علاوہ آنکھ مچولی، کوکلہ چھپاکی، اکھڑ باندھا وغیرہ شامل ہیں جبکہ علیحدہ کھیلوں، بولوں میں ککلی، ٹہنیاں، تھال، گڈی گڈا، رسّہ، گیدا، بھنڈا، بھنڈا ریا وغیرہ لڑکیوں کے اور گیڈیاں، گلی ڈنڈا، پتنگ بازی، کھدو کھنڈی، کنچیاں کہ پکیاں، پھڑن پھڑان ایں گئی، چور سپاہی وغیرہ لڑکوں کے کھیل ہیں۔

ان کے علاوہ لڑکیاں لڑکے بے ہنگم اچھل کود بھی کرتے ہیں اس میں "چھون چھپان" "برف دا بندہ" وغیرہ شامل ہیں۔ ہمارے موضوع کے ساتھ ان کھیلوں کا تعلق ہے جن کے ساتھ بول بھی ہوتے ہیں کہ یہ بول ہی لوک ادب کا حصہ ہیں۔ کچھ کھیلوں میں "پگنا" پڑتا ہے پگنے کے لئے جو بول موجود ہیں وہ ملاحظہ فرمائیں:

بڑے بڑے ساتھیو!
آپ کا ماں باپ بیٹے
کوئی لے چن، کوئی لے تارا، تارا

"پگنے" کے بعد مختلف کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ آنکھ مچولی جس کو پنجابی میں لکن میٹی کہا جاتا ہے اس میں صرف ایک بول استعمال ہوتا ہے:

لک چھپ جانا۔ کھی کا دانہ
راجے کی بیٹی آ گئی ہے آجا

ککلی، تھال، گیدا، کوکلہ چھپاکی، ٹہنیاں وغیرہ میں "پگنے" وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ کھیل یونہی مل جل کر شروع کر دیئے جاتے ہیں ان کے ساتھ باقاعدہ بول موجود ہیں یہ کھیل صرف لڑکیاں کھیلتی ہیں۔ ککلی کے بول ہیں:

ککلی کلیر دی
پھڑی میرے بھائی کی
دوپٹہ میری بھابی کا
نیلے منہ جوائی کا

itsurdu.blogspot.com

"گدا" کے بچپن کے بول اور نوعیت الگ ہے۔ بچپن کے "گدا" کے بول جس میں زیادہ لڑکیاں شامل ہیں۔

گدا کی ایک صورت دو لڑکیوں کا گدا بھی ہے جو صرف بچپن سے مخصوص ہے اس میں دو، دو لڑکیاں، دائرے یا قطاریں کھڑی ہو کر ایک دوسرے سے ہاتھ سے تالی بجاتی ہیں۔ بول ملاحظہ ہو:

طوطیا وے طوطیا
طوطا سکندر کا
پانی پیئے مندر کا
کام کرے دوپہروں کا
کاجل ڈالے تہروں کا
سفید چادر چاچے کی
چھلیاں والے کاکے کی

کوٹلا چھپائی میں تمام لڑکیاں دائرے میں منہ اندر کی طرف کر کے بیٹھ جاتی ہیں۔ ایک دوپٹہ کا کوٹلا بنا کر ان کے ارد گرد چکر لگاتی ہے اور گاتی ہے:

کوٹلا چھپائی جمعرات آئی ہے۔
جو آگے پیچھے دیکھے اس کی شامت آئی ہے۔

کھیلنے کے لئے بلانے کے "سدا" کے بول بھی پنجابی بچوں میں رائج ہیں۔ صبح ہوتی ہے تو ایک طرف سے آواز آتی ہے:

انگلا پلنگلا
بھائی تمہارا رنگلا
چڑیوں نے چوں چوں لگائی
لے ناقہ اُٹھ
تیرے بھائی کا بیاہ ہے۔

"چڑیوں نے چوں چوں لگائی" کا مطلب ہے۔ صبح ہو گئی ہے۔ اُٹھو اور ہمارے ساتھ کھیلنے کے لئے آؤ۔ اگر کوئی بچہ بلانے پر نہیں آتا تو اسے بول مار کر تنگ کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہوں:

چاند کی چاندنی، تارا گول مول
سارے بچے کھیلتے ہیں، شازی ماں کے پاس

کچھ کھیل ایسے ہوتے ہیں جو صرف بولوں تک محدود ہوتے ہیں۔ جیسے موسم کے لئے بارش مانگنا یا زیادہ بارش کے وقت دھوپ مانگنا، ویسے بارش مانگنے کے لئے بچوں کا "گڈی گڈا" جلایا جاتا ہے اور پھر گیت گائے جاتے ہیں جو اسی طرح کے ہوتے ہیں:

برس میاں کالیا۔ میں نے گڈی گڈا جلا دیا ہے
برس میاں چٹیا۔ میں نے گڈی گڈا پھاڑ دیا ہے
کالیاں اٹاں کالے روڑ۔ بارش برسا زور سے
ایڑیاں گھسائیں گے، بارش ہو گی نہائیں گے

بچے گنتی اور پہاڑوں کو یاد کرتے ہوئے بھی تفریح کا عنصر شامل کر لیتا ہے جیسے ایک دو تین۔ بابے بوڑھے کی مشین، بابا کم تولے ہے۔

تختی سکھاتے ہوئے گاتا ہے:

تختی خشک ہو جا
کالا چور آیا ہے
ڈنڈا لے کر آیا ہے
ڈنڈا گیا ٹوٹ
تختی خشک ہو گئی

یہ وہ تمام گیت اور بول ہیں جو پنجاب کے بچے بچے کی زبان پر آج بھی رقصاں ہیں۔ شہر کی بات تو چھوڑیئے، گاؤں میں بھی تفریح کے سامان شہر کی نسبت بہت کم ہوتے ہیں۔

itsurdu.blogspot.com

ان گیتوں کے ذریعے بچے تفریح بھی حاصل کرتے ہیں اور معصوم سے بولوں کے ذریعے بہت کم ہوتے ہیں۔ ان گیتوں کے ذریعے بچے تفریح بھی حاصل کرتے ہیں۔ اور معصوم سے بولوں کے ذریعے بہت سی باتوں کا ان کے ننھے منے دماغوں میں اضافہ بھی ہوتا ہے ان گیتوں بولوں اور کھیلوں کے ذریعے یہ بچے اپنے کلچر اور اپنی تہذیب کے ساتھ بھی جڑے رہتے ہیں اب چونکہ اپنے کلچر سے وابستگی دن بدن ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے اس لئے اب لوگ ان باتوں کو بھولتے جا رہے ہیں۔ اور نئی تہذیب کی نقالی کر رہے ہیں۔ وہ یہ بات بھول جانے کے موڈ میں دکھائی دیتے ہیں۔ کہ اپنی لوک دانش میں اب زمانے کا ساتھ دینے کا دم خم نہیں ہے جو کہ ان کی شاید بھول ہے۔ ذکر کئے گئے گیتوں، بولوں اور کھیلوں کا اگر نفسیات کی رو سے جائزہ لیا جائے تو ان میں ہر ایک گیت اور کھیل جدید نفسیات کے اصولوں کے مطابق اس AGE GROUP کے لئے درست ثابت کیا جا سکتا ہے بہر حال ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے اس لوک ورثہ کی اہمیت، افادیت اور ضرورت کو سمجھیں۔

سندھی میں بچوں کا ادب

حیدر سندھی

دوسری جنگ عظیم کے بعد جہاں زندگی کے دیگر شعبہ جات متاثر ہوئے وہاں دنیائے ادب میں بھی عالمگیر تبدیلی رونما ہوئی اور اسی حوالے سے سندھی ادب میں بھی یہ واضح تبدیلی نظر آتی ہے کہ اس ادب نے بچوں کے ادب کی ترقی کی طرف خصوصی توجہ دینی شروع کی۔

بچے ہر معاشرے کے روشن مستقبل کی علامت ہوتے ہیں اور ہر معاشرہ بچوں کی جسمانی پرورش کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی تربیت کا بھی خیال رکھتا ہے اسی خیال کو مدنظر رکھا گیا اور سندھی اخباروں اور رسائل نے بچوں کو ادب کی ترویج و ترقی کی طرف توجہ کی اور ہر اخبار (چاہے یومیہ ہو یا ہفتہ وار) نے ایک صفحہ بچوں کی تحریروں کے لئے مخصوص کیا اور اخلاقی و اصلاحی مواد شائع کیا۔ اسی طرح سندھی رسائل نے بھی اپنی ہر اشاعت میں ایک حصہ بچوں کی تحریروں سے سجانا اپنے لئے لازم سمجھا۔

اس عمل نے بچوں میں نہ صرف لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا کیا اور دلچسپی پیدا کی۔ بلکہ پورے سندھ کے بچوں میں ایک ادبی تحریک نے جنم لیا اور بچوں کی بے شمار ادبی انجمنیں قائم ہونا شروع ہو گئیں۔ یہ انجمنیں بچوں کے میلے، نمائش، علمی بحث و مباحثے اور معلومات عامہ کے مقابلے منعقد کراتی تھیں۔ اس قسم کی کاروائیاں بچے خود چلاتے اور ہر کاروائی کا مکمل ریکارڈ رکھتے تھے۔

اس طرح بچوں میں ادبی دلچسپی کا اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ انتظامی شعور بھی بڑھنے لگا۔ اس عمل نے جس ادبی تحریک کو جنم دیا۔ یہ اسی کا اثر تھا کہ بچوں کے ادب کی تخلیق ہونی شروع ہوئی اور ہر یک سٹال پر ادب کی بڑی تعداد موجود نظر آنے لگی۔

دراصل سندھی زبان میں بچوں کے لئے جو مواد شائع ہوا تھا اس کی ابتدا ۱۸۶۰ء کے بعد ہوئی۔ ہر زبان کے ادب کی طرح اس کی ابتدا بھی ترجمہ سے ہوئی۔ سب سے پہلے

itsurdu.blogspot.com

ہندوستان کی مشہور کتاب "طوطی نامہ" کو سندھی نام "طوطے نامو" سے ترجمہ کیا گیا۔

سندھ کے ضلع حیدرآباد کی تحصیل ٹرگھڑ کو سندھ ادبی تاریخ میں دو وجوہ سے اہم مقام دیا جاتا ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ اس تحصیل نے فارسی بحروں پر مشتمل عروضی شاعری کو سندھی شاعری میں نہ صرف رائج کیا بلکہ اس طرز کی شاعری کو عام کرنے کے لئے اس تحصیل کے جتنے مشہور شعراء گزرے ہیں ان کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ سید میراں محمد شاہ اوسل (۱۸۹۲ء-۱۹۲۹ء) نے بچوں کے نصاب کے لئے جہاں دیگر موضوعات اور عنوانات کو سپرد قلم کیا وہاں ایک مشکل ہندی کہانی کو بھی بچوں کے لئے سلیس سندھی میں ترجمہ کیا جو بڑی دلچسپ کتاب کی صورت میں موجود ہے۔

اس کہانی کا موضوع ایک نافل، سست اور نکمے بچے کا دوسرے ایک محنتی، ذہین اور اچھے بچے کے ساتھ تقابل تھا اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی تھی کہ اول الذکر بڑا ہو کر دنیا میں ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس دوسرا بچہ، جوان ہو کر ہر جگہ لائق عزت رکھتا ہے۔

دراصل اس کتاب "سدھاتو روآئیں کدھاتو رو" کی کہانی، سندھی بچوں کے مزاج کے مطابق تھی۔ اس لئے اس کا ترجمہ ادب میں تخلیقی عمل کی طرف پیش رفت ثابت ہوا اور آئندہ کے لئے جو بھی بچوں کے لئے کتاب لکھی گئی اس کا مخصوص نکتہ مذکورہ کہانی پر مرکوز ہوتا تھا۔

بچوں کے ادب میں کتابوں کی اشاعت اس وقت اور بھی تیز ہو گئی جس وقت شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ نے سندھی ادب کا دامن وسیع کرنے کے لئے قلم اٹھایا۔ اس شخص نے ۴۰ کے قریب کتابیں سپرد قلم کیں۔ جن میں تراجم کے ساتھ ساتھ تخلیقی مواد بھی ہے۔ یہ مواد ہر موضوع پر ہے۔ مثلاً ناول، افسانہ، ڈرامہ، انشا پردازی، مضمون نویسی، باغبانی، سیاست اور تاریخ وغیرہ۔ اگر اس مواد کی مزید تقسیم کی جائے تو معاشرے کے ہر طبقے کو اس مواد میں شامل کیا گیا ہے۔ چاہے وہ مرد ہو یا عورت، بچہ ہو یا جوان۔

اس طرح اس شخص نے بچوں کے لئے جو مواد تخلیق کیا اس میں بنیادی نقطہ ہی سامنے رکھا گیا ہے جو کہ عموماً ہر معاشرہ کا ادیب اپنے روشن مستقبل کی اعلیٰ ذہنی تربیت کے لئے سامنے رکھتا ہے۔

مرزا قلیچ بیگ نے مذکورہ موضوعات کو پیش نظر رکھ کر بیسیوں کتابیں بچوں کے ادب کی نذر ہیں ان میں سے ہر کتاب دوسری کتاب سے زیادہ دلچسپ، معلوماتی اور با مقصد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر کتاب، چھ چھ بار ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوتی رہی ہے۔

مرزا قلیچ بیگ کی کتابوں کی مقبولیت کو دیکھ کر دیگر ادیبوں نے بھی اس طرف توجہ دی اور کئی ادیبوں کے نام محض بچوں کے ادب تخلیق کرنے کی وجہ سے مشہور ہوئے۔

یہی حال بچوں کے لوک ادب کا ہے۔ ہر معاشرے میں جو داستانیں اور قصے مشہور ہیں ان کا مرکزی نکتہ بچوں کی ذہنی تربیت کرنا ہوتا ہے۔ ہر خطے کی بچیاں گڈے گڈی کا کھیل رچا کر عملی زندگی کو کامیاب بنانے کی تربیت حاصل کرتی ہیں جس میں رشتہ داروں سے تعلقات کو بحال رکھنے کے علاوہ گھر اور ماحول کو صاف ستھرا بنانے کا لاشعوری درس ملتا رہتا ہے اور اسی نسبت سے بچیوں کے ننھے منے فقروں پر مشتمل لوک گیت پروان چڑھتے رہتے ہیں۔

دوسری جانب بچے آپس میں کھیل کھیلتے رہتے ہیں ان کا مرکزی خیال بھی ذہنوں کی پرورش کرنا اور اپنے آپ کو مستقبل کا بوجھ اٹھانے کے لائق بنانا ہوتا ہے۔ ان کے کھیل کی نسبت سے لوک گیت ہوتے ہیں۔ یہ گیت سوچ سمجھ کر قلم اٹھا کر نہیں بنائے جاتے بلکہ غیر ارادی طور پر ایک ہی تال کے فقرے جڑنے کے بعد مکمل ہوتے ہیں۔ اور ان میں کوئی پیغام یا مقصد نہیں ہوتا سوائے تفریح اور مزاحیہ کلمات کے۔ لیکن ان گیتوں کے توسط سے بچے اپنی زبان سیکھتے ہیں اور اپنے ذخیرے میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ صوتیات پر بھی عبور حاصل کر لیتے ہیں۔

سندھی زبان کے پاس اس قسم کے لوک گیتوں اور داستانوں کی بہت بڑی دولت موجود ہے جس کو سندھی ادبی بورڈ نے بچوں کے ایک ماہنامے "گل پھل" کے اجراء سے

itsurdu.blogspot.com

جمع کرنا شروع کیا تھا۔

اسی رسالے نے بچوں کو اتنا ادبی شعور بخشا کہ دوبارہ سینکڑوں ادبی انجمنیں وجود میں آگئیں جو کہ اپنے طور پر بچوں کے اخبار، رسائل اور کتب شائع کرنے لگیں۔ لیکن سرپرستی نہ ملنے کے باعث تھوڑا عرصہ چلنے کے بعد ختم ہوگئیں۔

اس کے علاوہ بھی بیسویں صدی کے پہلے نصف میں ہمیں بیسیوں ایسی انفرادی کوششیں ہوتی نظر آتی ہیں جو نہ صرف بچوں کی لوک کہانیوں، لوک شاعری اور بچوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو یکجا کرنے پر مرکوز رہی ہوں۔ لیکن وہ بھی سرپرستی نہ ہونے کے سبب ختم ہوگئیں۔

اس سلسلہ میں قیام پاکستان کے بعد ابتدائی سالوں میں کوئی خاص کام نظر نہیں آتا۔ لیکن اسی صدی کے دوسرے نصف کے شروع ہوتے ہی سندھی ادب نے پانسا پلٹا تو بچوں کی ادبی سرگرمیوں کو پہلے سے زیادہ تیز پایا جاتا ہے اور بے شمار ایسی انجمنیں نظر آنے لگتی ہیں جن کے شب و روز بچوں کی بھلائی اور ان کی ادبی سرگرمیوں کو بڑھانے میں گزرتے ہیں۔

یہ انجمنیں صرف بچوں کو مستقبل کی ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل بنانے کے لئے ہمت، حشمت، مردانگی، ہوشیاری، مستقل مزاجی، لکھنے پڑھنے میں دلچسپی، اپنے پرائے میں تمیز، دوست دشمن کی پہچان کے ساتھ ساتھ محفل میں نشست و برخواست کے آداب اور اخلاقی تعمیر کے پہلوؤں کو نیچر، مقالے، ڈرامے، مضامین اور چھوٹی چھوٹی نیم تاریخی کہانیوں کی شکل میں مہیا کرتی تھیں۔

اس ماحول کے پیش نظر حیدرآباد، کراچی، لاڑکانہ اور سکھر جیسے سندھ کے بڑے بڑے شہروں نے تو دلچسپی لینی ہی تھی مگر ٹنڈو محمد خان، مورو، نواب شاہ، سکرنڈ، ٹوبہ ڈیلپر، ہالہ، دادو، میرپور خاص، شکارپور اور کندھ کوٹ جیسے پسماندہ اور پست حال قصبوں سے بھی بچوں کے اخبار اور رسائل جاری ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ڈاکٹر شمل جیسی ایک عالمی شہرت کی حامل خاتون بھی یہ لکھنے پر مجبور ہے کہ:

"سندھی ادب میں بچوں کے شائع شدہ مواد کی تعداد حیرت انگیز حد تک زیادہ موجود ہے۔"

itsurdu.blogspot.com

ہماری دیگر مطبوعات

لغاتِ نظامی اردو	ناظر حسن زیدی
شہپرِ جبریل	ڈاکٹر محمد ریاض
معاویہؓ	عمر ابو النصر
عائشہؓ	مولانا جلال الدین سیوطی
ہمارے تعلیمی مسائل	محمد عبد العزیز
جدید تعلیمی تقاضے	شفیق احمد عزیز
مثنوی مولانا روم مکمل چھ جلد	مولانا قاضی سجاد حسین
خلفائے راشدین	حاجی معین الدین ندوی
الغزالی	علامہ شبلی نعمانی
سیرۃ النعمان	〃 〃 〃
المامون	〃 〃 〃
عقائد	〃 〃 〃
معجزات نبوی	〃 〃 〃
سیر الصحابیات	مولانا سید احمد انصاری
جدید اردو غزل ایک مطالعہ	نظیر صدیقی
چوپال	احمد ندیم قاسمی
بگولے	〃 〃 〃
طلوع و غروب	〃 〃 〃
سیلاب و گرداب	〃 〃 〃
آنچل	〃 〃 〃
آبلے	〃 〃 〃
گھر سے گھر تک	〃 〃 〃

S. Rashid

گلوب پبلشرز ، اردو بازار لاہور